دیکھو یہ میرے زخم ہیں

منوّر جمیل

فہرست

۱ ـــ پیش لفظ — منور جمیل — ۱۲
۲ ـــ نعت لکھنے کا اگر مجھ کو قرینہ آجائے — ۳۲
۳ ـــ بہ احتیاط عقیدت بہ چشمِ تر کہنا — ۳۵
۴ ـــ زندگی کو حسن کا اِک زاویہ دیتا ہے وہ — ۳۷
۵ ـــ اسم احمد — ۳۸
۶ ـــ ایک شعر — ۴۰
۷ ـــ نظر عذابوں میں گھِر گئی ہے سخن سرابوں میں آگیا ہے — ۴۱
۸ ـــ یہ دوریوں میں لمحۂ وصال کیسے آگیا — ۴۳
۹ ـــ سرِ شام جب بھی دیا جلا تو خیال تیری طرف گیا — ۴۵
۱۰ ـــ کسی کے ہونٹوں پہ گرچہ روشن کوئی بھی حرفِ دُعا نہیں ہے — ۴۶
۱۱ ـــ پرائی خواہش کی پاسبانی سے بچ گیا ہُوں — ۴۷
۱۲ ـــ یہاں لوگوں نے زر کے واسطے کیا کیا نہیں چھوڑا — ۴۸
۱۳ ـــ کسی بہانے، کسی کے سبب سے چاہتا تھا — ۴۹
۱۴ ـــ یہ نہیں گر پڑی دیوار ہی سر پر میرے — ۵۱
۱۵ ـــ دل نے تیرے بارے میں پوچھا تو بہت رویا — ۵۳
۱۶ ـــ اِک یہ نہیں کہ کُھل کے کبھی رو نہیں سکا — ۵۴
۱۷ ـــ مجھ کو رسوا سرِ محفل تو نہ کروایا کرے — ۵۵
۱۸ ـــ نہیں کہ تیری محبت پہ اعتبار نہ تھا — ۵۷
۱۹ ـــ کسی کی بات ہو لہجہ اُسی کا لگتا ہے — ۵۹
۲۰ ـــ تجھ سے اب اور محبت نہیں کی جائے گی — ۶۱

۲۱ ـــ آنکھوں سے چھلکتا ہوا پانی کہاں لے جاؤں ۶۲
۲۲ ـــ تیری مجبت کے یہ خواب ۶۳
۲۳ ـــ حصارِ لفظ و بیاں میں گم ہوں ۶۵
۲۴ ـــ میری آنکھوں کو سوجھتا ہی نہیں ۶۷
۲۵ ـــ کیا کہیں تم سے کہ کیسے حوصلہ ہم نے کیا ۶۹
۲۶ ـــ اشک اپنی آنکھوں سے خود بھی ہم چھپائیں گے ۷۰
۲۷ ـــ خیال و خواب کی لمبی مسافتوں سے بچا ۷۱
۲۸ ـــ صحرا ہیں دو آنکھیں تھیں اِک پیڑ خزانہ تھا ۷۳
۲۹ ـــ فیصلہ (نظم) ۷۵
۳۰ ـــ معذرت (نظم) ۷۷
۳۱ ـــ ایک نظم ۸۰
۳۲ ـــ زمین پر ہے مگر آسمان لگتا ہے ۸۱
۳۳ ـــ چُپ نہ رہتے بیان ہو جاتے ۸۲
۳۴ ـــ یہ دل بھلاتا نہیں ہے محبتیں اُس کی ۸۳
۳۵ ـــ بدن نڈھال ہے آنکھوں میں خواب زندہ ہیں ۸۵
۳۶ ـــ یہ میری عمر میرے ماہ و سال دے اُس کو ۸۶
۳۷ ـــ میرے رستے میں اِک دیوار باقی ہے ابھی تک ۸۷
۳۸ ـــ آئندہ کبھی اُس سے محبت نہیں کی جائے ۸۹
۳۹ ـــ دل تھا کہ خوش خیال تجھے دیکھکر ہوا ۹۱
۴۰ ـــ اِک پشیمان سی حسرت سے مجھے سوچتا ہے ۹۳
۴۱ ـــ اب کس سے کہیں اور کون سُنے جو حال تمہارے بعد ہوا ۹۵
۴۲ ـــ کون بھنور میں ملاحوں سے اب تکرار کرے گا ۹۶
۴۳ ـــ آسمان پر دو ہمیں کا اِک خلا موجود ہے ۹۷

۴ ـــ شکستہ حال ہُوں دل سے بھلا نہ دینا مجھے ۹۸
۴ ـــ ایک شعر ۹۹
۴ ـــ عجیب وہم سے اب کے دلوں میں بیٹھ گئے ۱۰۰
۴ ـــ اپنے لہو سے فصل اُگانے والا میں ۱۰۲
۴ ـــ دستک (نظم) ۱۰۴
۴ ـــ خواب و خط کے جلنے میں دیر کتنی لگتی ہے ۱۰۵
۵ ـــ گریز شب سے سحر سے کلام رکھتے تھے ۱۰۷
۵ ـــ مَیں کن لوگوں میں ہُوں کیا لکھ رہا ہُوں ۱۰۹
۵ ـــ یہ عمر بھر کا سفر اور یہ رائیگانی تیری ۱۱۱
۵ ـــ کیا بتائیں کیوں دیتے دمساز نے ۱۱۲
۵ ـــ مجھے موت دے کہ حیات دے ۱۱۳
۵ ـــ بہت تاریک صحرا ہو گیا ہے ۱۱۵
۵ ـــ بند ہوتی کتابوں میں اُڑتی ہوئی تتلیاں ڈال دیں ۱۱۶
۵ ـــ مکمل کچھ نظر آتا نہیں ہے ۱۱۷
۵ ـــ ہر اک لمحہ نیا اِک امتحاں ہے ۱۱۹
۵ ـــ عشق کرو تو یہ بھی سوچو عرضِ سوال سے پہلے ۱۲۱
۶ ـــ کشمیر (نظم) ۱۲۲
۶ ـــ سوچوں کی تیز دھوپ میں ٹھہرا دیا گیا ۱۲۵
۶ ـــ بجھتی آنکھوں کا دھواں اور میں اکیلا آدمی ۱۲۷
۶ ـــ یہ دیکھ کر کہ وہ وعدہ خلاف آیا نہیں ۱۲۹
۶ ـــ اپنے دل کو ترا وعدہ نہیں ہونے دوں گا ۱۳۰
۶ ـــ ایک شعر ۱۳۲
۶ ـــ خواہش (نظم) ۱۳۳

۶۷ ـــ عہد (نظم)
۶۸ ـــ دشمنِ جاں کئی قبیلے ہوئے
۶۹ ـــ پلٹ کر پھر کبھی اُس نے پکارا ہی نہیں ہے
۷۰ ـــ یہی نہیں کوئی طوفاں میری تلاش میں ہے
۷۱ ـــ کل اثاثہ تھا اِک دیا لوگو
۷۲ ـــ چراغ لے کر چلا تھا گھر سے ہوا کے ہاتھوں میں آگیا ہوں
۷۳ ـــ منفرد سا کوئی پیرایۂ فن چاہتی ہے
۷۴ ـــ اب اپنے فیصلے پر خود اُلجھنے کیوں لگا ہُوں
۷۵ ـــ ہجر کی شب میں قید کرے یا صبحِ وصال میں رکھے
۷۶ ـــ اپنی نظروں سے جو گِر جائے وہ چہرہ نہ بنا
۷۷ ـــ کتبہ
۷۸ ـــ دکھ کے عذاب سہہ لیے ہم نے ہجرتوں کے بعد
۷۹ ـــ ترا ہی ذکر ہے شہرِ ہُنر میں رکھا ہوا
۸۰ ـــ جتنا تجھے چاہا تھا
۸۱ ـــ احتیاط
۸۲ ـــ احساس
۸۳ ـــ مشورہ
۸۴ ـــ یہی دن تو میرا غرور ہے
۸۵ ـــ لہو بھی آنکھ سے اب بہہ گیا ہے
۸۶ ـــ تمہیں خبر ہی نہیں کیسے سر بچایا ہے
۸۷ ـــ آثار
۸۸ ـــ عمرِ رائیگاں کر دی تب یہ بات مانی ہے
۸۹ ـــ اب یہ بات مانی ہے

۹۵ ـــ آنکھیں جو دیکھتی تھیں وہ منظر بھی چھن گیا ۱۷۵
۹۷ ـــ ہجر سہنے کی غم شناسی کی ۱۷۶
۹۷ ـــ پوچھ تو پھول سے کیا کرتی ہے ۱۷۷
۹۱ ـــ ہمارے بس میں اگر اپنے فیصلے ہوتے ۱۷۹
۹۳ ـــ وہ جو شامِ شہرِ وصال میں ۱۸۰
۹۵ ـــ یقین ۱۸۳
۹۶ ـــ ایک شعر ۱۸۶
۹۷ ـــ واہمہ ۱۸۷
۹۹ ـــ تمہیں تو پہلے کہا تھا میں نے ۱۸۹
۱۰۰ ـــ کہاں کی منزلیں، اب تو سراب چاہتا ہے ۱۹۱
۱۰۲ ـــ یہ اب تو کس لیے دل گیر ہوتا جا رہا ہے ۱۹۳
۱۰۴ ـــ ایک شعر ۱۹۴
۱۰۵ ـــ شعر کہنا ہے مگر اُس میں گلہ لکھنا نہیں ۱۹۵
۱۰۷ ـــ بس بہت ہو چکا ۱۹۶
۱۰۹ ـــ شام کی طرح اندھیروں میں اُتر جاؤں گا ۱۹۹
۱۱۱ ـــ گلہ کرے بھی اگر دل تو کیا کرے اُس سے ۲۰۱
۱۱۳ ـــ رکھ دیں نہ ترے خواب جزیروں کو جلا کر ۲۰۳
۱۱۴ ـــ شام آواز کا استعارہ نہیں ۲۰۵
۱۱۶ ـــ برتھ ڈے ۲۰۷
۱۱۷ ـــ دلیلیں شک کریں گی ۲۱۰
۱۱۹ ـــ کب سے چادر اوڑھ کے بیٹھی ہے غم کی ۲۱۳
۱۲۱ ـــ گمان ۲۱۵
۱۲۳ ـــ دل جو دریا تھا آج صحرا ہے ۲۱۷

۱۱۳ ـــ ہم تو جا چکے جاناں
۱۱۴ ـــ پتھر نہ بن وہ قرب کے رشتے بحال کر
۱۱۵ ـــ کتنی دور تلک وہ تنہا جا سکتا ہے
۱۱۶ ـــ عہدِ وفائے طرزِ محبت بدل نہ جائے
۱۱۷ ـــ میں بہت بھٹکا بالآخر شام کو گھر آ گیا
۱۱۸ ـــ ایک شعر
۱۱۹ ـــ خیال تھا کہ تجھے رازداں بنا لیتے
۱۲۰ ـــ کس طرح کٹتی ہیں راتیں جگنوؤں سے پوچھنا
۱۲۱ ـــ یہ نام ممکن نہیں رہے گا، مقام ممکن نہیں رہے گا
۱۲۲ ـــ سکوں سے سانس لینے کے سبھی رستے مٹا دے گا
۱۲۳ ـــ ایک شعر
۱۲۴ ـــ دو شعر
۱۲۵ ـــ بے فیض موسم کی رفاقت میں
۱۲۶ ـــ آنکھیں بھول آیا ہوں
۱۲۷ ـــ مری غزل میں دکھوں کے سائے بھی حوصلوں کی شکست کے ہیں
۱۲۸ ـــ دو شعر
۱۲۹ ـــ یہ رستہ اور ہے
۱۳۰ ـــ ایک شعر
۱۳۱ ہائیکو
۱۳۲ متفرق اشعار

۱۱۸
۱۲۰
۱۲۲
۱۲۳
۱۲۵
۱۲۷
۱۲۸
۱۲۹
۱۳۰
۱۳۱
۱۳۲

بے حساب محبتوں کا شاعر

میں اپنی بات کے ابلاغ کے لیے غالبؔ کے ایک شعر کا سہارا لیتا ہوں

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا

کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے دل کے لہو کی ایک ایک بوند اُن راہوں اُن
ں پر بچھا دے جہاں جہاں سے اُس کا محبوب گزرنے والا ہو۔ یا ایسا ایثار صرف
ری اظہار کے تخیلاتی اور تصوراتی امکانات کا شاخسانہ ہو سکتا ہے۔

اپنی محبت کے لیے قربانیاں دینا اپنی چاہتوں پر سب کچھ نچھاور کر دینا ـــ
لوث و بے پناہ جذبوں کے ساتھ محبت کو پرستش میں بدل دینا۔ اپنے دلبروں
لیے اپنی ساری خوشیاں تیاگ دینا اہلِ دل کا وطیرہ تو رہا ہے مگر اپنی ساری تخلیقی
نات۔ اپنی لامحدود شعری صلاحیتیں، اپنا بے پناہ جینئس۔ فہم و دانش اور
ی جولانیوں کے کمال مظاہر جیب چاپ بہ رضا و رغبت ایک سخن نا آشنا کے
م منتقل کر دینا۔ اپنی تخلیقی کائنات کو یوں تج دینا شاید اتنا آسان نہیں اِس کے
بہت بڑے درویشانہ اور صوفیانہ ظرف کی ضرورت ہوتی ہے

مُن میں رانجھن ہوئی یا میں ناہیں سب توُں

جیسی شاہ حسینؒ۔ خواجہ فریدؒ اور بُلھے شاہ کی اس ریت روش کی پیروی کرنے
یہ غریب الدیار آج اپنے دُکھوں لامتناہی اذیتوں اور اعترافِ شکست کے
کرب کے ساتھ اپنے گذشتہ ماہ و سال کے زخم سمیٹ رہا ہے

کبھی لوٹ آئیں تو پوچھنا نہیں دیکھنا انہیں غور سے
جنھیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

اب خود اس شاعر خانماں برباد کی اپنی رُوح کی سسکاریاں بھی م
پہنچ رہی ہیں۔

وہ جس کے دامن میں شاعری تھی بہار لہجے کی لُٹ لُٹا کر
اے ربِ لفظ و بیاں وہ شاعر تری پناہوں میں آ گیا

آج کچھ سائنس دان انسانی کلوننگ پر تجربات کر کے دنیا کو محوِ حیر
ہوتے ہیں۔ شعر و سُخن کی دُنیا میں ۱۶ برس پہلے بہاولپور کے اس نابغہ
شاعر نے اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تخلیقی سطح پر فکری کلوننگ کا
اور اپنی ذات سے نکل کر کسی اور پیکر میں منتقل ہو گیا۔ ایک نئے جنم کے
اس کے شعری اظہار کے رنگ تذکیر سے تانیث میں بدل گئے۔ اس کا مم
اس کا محبوب سات سمندر پار تک شہرت، عزت، دولت سمیٹتا رہا۔ شعر
کے آسمان پر ایک درخشاں ستارے کی طرح چمکتا رہا۔ اس کی فہم و فراست
تخلیقی دانش کو علم و ادب کے ایوانوں میں بے پناہ پذیرائی ملتی رہی۔ ایک
مصرعے اور ایک ایک شعر پر داد و تحسین کے شور بلند ہوتے رہے۔ یہ
اشعار کا حقیقی خالق سر جھکائے بے نامی و گمنامی کی چادر اوڑھے مشاعرو
پچھلی نشستوں پر بیٹھا اپنے افکار۔ اشعار اور تخلیقی شاہکار کی سربلندی
سرشار ہوتا رہا۔ نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی کوئی آرزو۔ یہ کیسی محبت تھی

لیدا گھاؤ تھا، یہ کیسا لگاؤ تھا، جو ایک شاعر نے اپنے دل پر کھایا تھا

آج جب ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ اُس نے اپنے وجود سے جادو کی سوئی
کال پھینکی ہے اور اب وہ اس سحر سے آزاد ہو چکا ہے تو بھی اُس کا یہ عالم
ہے کہ آج بھی اس پر تخلیق کے در صرف اُس وقت وا ہوتے ہیں جب وہ اپنی
ات کی مکمل نفی کر کے کسی اور قالب میں ڈھل کر سوچتا ہے۔ اس کی رُوح میں
ہ محبت اتنی راسخ ہو چکی ہے کہ اس حصار سے باہر آنا اُس کے بس سے باہر ہے
ب وقت آ گیا ہے کہ اس کی بے حساب محبتوں کو شمار کیا جائے۔ اس کے خوابوں
ی صداقت کو پرکھا جائے اُس کے زخموں کو مندمل کیا جائے۔ اس کی بے انت
ائیگانی کا کفارہ ادا کیا جائے۔ اور اس قُقنس کو اپنی آگ میں بار بار جلنے
ے بچایا جائے ایک شاعر کو اس کا سارا تخلیقی سرمایہ واگزار کرا کے
واپس کیا جائے اور اس بات کا برملا اعتراف کیا جائے کہ وہ اپنے عہد
کا ایک انتہائی معتبر شاعر ہے۔ لفظ و بیاں کے حقیقی خالق و مالک کی شاعرانہ
ظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے۔ اس کے گم گشتہ ماہ و سال اور اس کے شاعرانہ
مال پر اس کے اپنے نام کی تختی آویزاں کی جائے۔

ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر

حرفِ آغاز

نہیں بات یہاں ختم نہیں ہوتی
یہاں تو ہوا کا کردار ختم ہوا ہے
یہاں تو میری ساری شاعرانہ
ریاضت کا تصور ٹکڑے ٹکڑے ہوا ہے
نہیں بات یہاں ختم نہیں ہوتی
بات تو اب شروع ہوتی ہے
یقین کی آنکھیں تو اب بینائی سے محروم کی جا رہی ہیں
دیوارِ جاں کی بنیادوں میں دراڑیں تو اب ڈالی جا رہی ہیں
ضبط کی لاکھ کوششوں کے باوجود
آنکھوں سے اُس کے سارے خواب
گرتے ہی چلے جا رہے ہیں
اس سے پہلے تو
مجھے کچھ بھی یاد نہیں تھا
کہ میں نے "روشنی" کے فریب

میں کتنا اندھیرا کاٹ لیا
مجھے تو بس وہ
رات رنگ آنکھیں یاد رہیں
وہ شام رنگ چہرہ
اُس کے لب و رخسار پر
شادابیاں بکھیرنا یاد رہا
اس کے قامت و قد کو
آسمان کرنا یاد رہا
مَیں تو اُس کے راستے بناتا بناتا، خود غبار میں اَٹ گیا
مجھے تو کچھ پتہ نہیں چلا
سُورج کب طلوع ہوا
اور کہاں غروب ہُوا
میں تو روز و شب سے بے خبر
بس
اُسکی ذات و حیات سے محبت کر رہا تھا
آنکھیں بند کر کے اُس کی عبادت کر رہا تھا
شعر لکھ لکھ کر
نظمیں کہہ کہہ کر
اُس کے قدموں میں انبار لگاتا چلا جا رہا تھا
ربِّ لفظ و بیاں نے
مجھے صبیح تیسی تخلیقی کائنات عطا کر رکھی تھی

خوابوں اور خیالوں کی
وہ ساری کی ساری
میں نے کہیں لفظوں میں
کہیں جذبوں میں
کہیں رنگوں میں
اُس کی نذر کر دی
مَیں نے تو اپنے حصّے کی
روشنی بھی اُس کے قدموں میں رکھ دی
اور
اُس کے راستے کی ساری گرد
اپنے مقدّر میں سمیٹ لی
اپنے سارے کے سارے خواب
اور خواب دیکھنے والی آنکھیں
اُس کی پیشانی پر سجا دیں
مَیں نے اُس کی آنکھوں سے کائنات کو دیکھا اور محسوس کیا
جو اُس نے چاہا، ویسا ہی میں نے چاہا
جیسا اُس نے سوچا ویسا مَیں نے کر دکھایا
میرے لکھتے ہوئے لفظوں نے اس کی شہرت کو پَر لگا دیئے
اُس سے محبّت کرنیوالوں
کی صفیں بندھ گئیں
چاہتیں اُس کے مقدّر کا حصّہ بنیں

تو بنتی ہی چلی گئیں
مَیں نے اپنی تخلیقی سچائی کے تمام تر حُسن کو
دیانتداری سے
اپنے خدا کو گواہ بنا کر
اُس کے لہجے میں گلابوں کی طرح سجا دیا
مہک تھی کہ بڑے بڑے تخلیق کاروں کی سماعتوں کے
آئینوں پر اپنا عکس بناتی چلی جا رہی تھی
آنکھیں تھیں کہ بے شمار زاویوں سے
اُس کے شاعرانہ تکلّم پر نچھاور ہوتی جا رہی تھیں
ہوتی ہی چلی جا رہی تھیں
ہجوم بڑھتا جا رہا تھا
اور
مَیں کہیں اس ہجوم کی
گرد میں گم ہوتا چلا جا رہا تھا
متانت کی اَنا
تمکنت کی شاخوں پر شبنم بنتی چلی جا رہی تھی
اور ـــــ ہوا
زینہ بہ زینہ ـــــ اپنے ریشمیں قدم
پہلے میرے دل پر رکھتی
اور
پھر دوسرا قدم

کبھی نیلے اور کبھی تاروں بھرے آسمان پر
اور میں کبھی دھوپ کی رہگذار پر اور کبھی تاریکیوں کے
بے چراغ رستوں پر
اپنی ہتھیلیوں پر
دُعاؤں کے دِیے جلائے
کبھی اُس کے راستوں میں روشنی بچھاتا
اندھیرے چُنتا
اور کبھی سائے اکٹھے کرتا
اپنے رنگ سے بے رنگ ہوتا چلا جا رہا تھا
مگر ایک یقین میرے ساتھ ساتھ تھا
ایک خوش گمانی کا اعتماد
اور ایک اعتبار کی موج، میرے دل کے سمندر میں رقص کر رہی تھی
کہ ہوا کو زندگی
اور زندگی کو ایک وقار مجھ سے ملا ہے
تو وہ میرے جذبوں کی نیکی کے چراغوں کو بجھانے سے گریز کرے گی
میرے تخلیقی عمل نے اُسے دُنیا کے کامیاب سفروں پر
دعاؤں کے عرشے پر روانہ کیا ہے
تو وہ مجھے گرد گرد ہونے سے
اگر بچا نہیں پائے گی تو فراموش بھی نہیں کرے گی
اُس کی پوری شخصیت کو ایک رنگ اور آہنگ مجھ سے ملا تھا
مجھے تو یہی زعم بہت تھا

کہ میں اُس کے ہونٹوں سے خود کو ادا ہوتے ہوئے
کہیں بہت دُور، دیکھتا اور کہیں بہت نزدیک سنتا رہا ہوں
اُس کی آواز میرے لفظوں سے
وہی تصویریں بناتی ہوتی محسوس ہوتی
جو میں تخلیقی لمحوں میں
اپنے تصور سے
اپنے خواب و خیال کی دیواروں پر
رات رات بھر جاگ جاگ کر بناتے بناتے
صبح کر دیتا
مگر نجانے کیوں
میرے لاشعور میں ایک خوف کہیں چھُپ کر بیٹھا ہُوا تھا
وہ کہیں کہیں میری اندھی محبت اور میرے تخلیقی ایثار پر
میرے راستے کی دیوار بنتا رہا ہے
مجھے روکتا رہا ہے
مجھے ٹوکتا رہا ہے
مگر
مَیں ہوا کے کردار پر شک کرنیوالے لاشعور کو کبھی خاطر میں نہیں لایا
میں لکھتا رہا
لکھتا ہی چلا گیا
یہاں تک
کہ مَیں اپنے لیے لکھنا ہی بھُول گیا

جیسے مَیں خود کو بھول گیا
مَیں کئی زاویوں سے
اُسے سنوارتا ـــــ نکھارتا
اور اُسے پکارتا رہا ـــــــ
ہوا کی "خوشبو" کی رفاقت میں
مَیں نے کئی بار خود کو غیر محفوظ راستوں کا رِزق کر لیا
کبھی روح اور کبھی جسم و جاں پر زخم سہہ لئے
مگر ان لہُو رِستے زخموں پر
ضبط کی چادر ڈالے رکھی
چُھپاتے رکھے سارے گھاؤ ہوا کی آنکھوں سے بھی
وقت لمحہ لمحہ آگے بڑھتا رہا
اور اس یقین کے باوجود
کہ ہوا کو لکھنا نہ آ سکے گا ! پھر بھی
یہ میرے کردار و ایثار کا سب سے روشن ثبوت تھا
کہ مَیں نے یہاں خود کو نفی کر کے
اپنی محبّت اور ہوا سے
اپنی غیر مشروط عقیدت کو سُرخروئی کی مہک فراہم کر دی تھی
ہوا اپنے قدموں تلے
میرے اعتماد کی زمین پر سفر کر رہی تھی
منزلوں سے ہمکنار ہوتی ہوئی
آسودگی جاں اور آسائش کا ساماں سمیٹتی

ہوا
کبھی کبھی غرور و بے گانگی ـــــ کے موسموں میں بھیگ جاتی
مگر اپنی شہرت، عزّت محبّت اور دولت کا شعور
رکھنے والی ہوا کو حالات کی دھوپ کا احساس جلد ہی اپنی رَوِش پر لے آتا
ذہانت اور عیاری کبھی کبھی دونوں ساتھ بھی چل پڑتے ہیں
عیاری اور طرح کا زخم دیتی ہے
تو ذہانت اور طرح کے تحفظات فراہم کرتی ہے
ہوا ـــــ کا کام تو بس چلنا ہے
مجھے اس بات کا کبھی احساس نہیں رہا کہ
ہوا کی فطرت میں مُڑ کر دیکھنا نہیں ہے
مگر مَیں نجانے کیوں ہوا کو قابلِ اعتبار منوانے میں
بے اعتباری کی ریت میں دھنستا چلا جا رہا تھا
ہوا جہاں کا بھی رُخ کرتی
"انتظار تو مَیں کرتا"
اُس کی عافیت سے واپسی کے لیے ـــــ دعاؤں کے چراغ
اپنے لہُو سے میں روشن رکھتا
خواب جیسا ـــــ ریشم و ملائم زمانہ اُس کے لئے تھا
اور عذاب جیسی ـــــ محرومیوں کی ہمشکل زندگی میرے لیے
سو ـــــــ اس بار ہوا جب سمندر پار
میری شاعری کے عرشے پر روانہ ہوئی
تو دل نے اُس کی کامرانی

اور قد و قامت کی سلامتی کی دُعائیں مانگتے مانگتے
انتظار کے ساحل پر خود کو ریت کر لیا
بلا کا زعم لیے پھر رہا تھا
مَیں اپنے دامن میں
مگر ـــــ ہوا نے راہ بدلنے میں
ذرا بھی دیر نہ کی، مجھ سے مشورہ نہ کیا
سات سمندر پار کی چمک نے اُس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا
بھول گئی وہ کہ ابھی تو اُسے اس سے بھی آگے جانا تھا
مگر ـــــ شاید اُس کا یقین کمزور تھا
سو یہ سفر تمام ہُوا
اور ہوا نے اپنی خواہشوں کو
اچانک اور پلک جھپکتے ہی
سماعت میں پڑنے والی پہلی آواز کا ہی دُلہن بنا لیا
دل نے ملال نہ کیا
آدرجوصلوں کی چادر تان لی
اور اس طرح اپنی ذاتی غرض کی دُھوپ سے خود کو بچا لیا
اور سوچا کہ ـــــ ہوا
شاید اسی منزل کی تلاش میں اُڑتی پھر رہی تھی
دل و دماغ نے ایک ساعت رائیگاں کئے بغیر
ہوا کے گھر آنگن میں پھول کھلنے
اور اس کی خوشیوں کے باغ کے ہمکتے رہنے کی دُعا مانگی

دل کو لگا کہ یہی اُس کے خواب تھے
دل کو لگا کہ یہی اُس کی شناخت ہے
دل کو لگا کہ یہیں سے اُس کو ایک نیا اعتبار میسّر آئے گا
دل نے اُس کی منزل کیلئے بھی دُعائیں کیں
اور اُسے بھی آنکھوں اور پلکوں پر
خوابوں کی طرح سجا لیا
مگر ـــــ
مگر ـــــ یہ کیا
آنکھیں اُس پار جو دیکھ رہی تھیں
وہ خیال ریزہ ریزہ ہو رہے تھے
وہ خواب بھی منتشر ہو رہے تھے
تشویش، اندیشے، واہمے، وسوسے میرے چاروں طرف
پھیل گئے ـــــ پھیلتے ہی چلے گئے
مگر مَیں تو بے شرطِ رفاقت کا مارا ہوا انسان تھا
دعائیں دیتا رہا
مجھے خیال تھا اُس کا، اُسے زمانے کا
خدا کرے کہ زمانہ وفا کرے اُس سے
مَیں نے اپنی ہتھیلیوں پر
اس کی سلامتی کے چراغوں کو کبھی بجھنے نہیں دیا
کبھی کبھی کوئی اچھی خبر آتی تو دل شکرانے ادا کرتے نہ تھکتا
لمحہ لمحہ وقت ـــــ قطرہ قطرہ سمندر ہوتا چلا گیا

میں سمندر پار کے مناظر سے کہاں بہرہ ور ہوا
مگر مَیں نے اس عرصے میں بھی ـــــ رفیقانہ بدعہدی کے باوجود
ہوا کی تخلیقی کائنات کو روشن رکھّا
مَیں نے جو منظر نہیں دیکھے تھے
اُن میں بھی رنگ بھرتا رہا
مَیں جن رستوں پر نہیں چلا تھا
مجھے اُن سے بھی باتیں کرنا پڑیں
جن بارشوں میں، میں نہیں بھیگا
وہ آنسو بھی مجھے رونا پڑے
جن پاؤں پر ـــــ اُس نے تھکن کی گرد محسوس کی
وہ تھکانیں بھی مَیں نے اپنے وجود میں منتقل ہوتی دیکھیں
وہ کہیں ایک رات جاگتی
تو میں کئی راتوں کی نیندوں سے محروم ہو جاتا
یہاں بیٹھ کو کیا کیا نہ کر لیا اُس کے لئے
کیا کیا نہ سہہ لیا اپنے دل کے لیے
کیسی کیسی تحریریں، قلم کہانی اور کبھی کالم کہانی نہیں بن گئیں
جو اچھا شعر کہا اُس کے قدموں میں رکھ دیا
جو اچھا رنگ دیکھا ـــــ اُس کے لیے دیکھا
جو اچھا موسم جانا ـــــ اُس کے لیے جانا
جو اچھی بات سنی ـــــ اُسے یاد کر لیا
جو دُعا پڑھی ـــــ اُس کے لیے پڑھی

جب خدا کو یاد کیا ـــــ اُس کے لیے کیا
مگر ـــــــــ مگر کیا
سارا بھید تو کھُلتا جا رہا تھا
مگر اُس کی محبّت سے بھرا ہوا دل
اپنی آنکھوں کی ویرانی چھپانے میں مسلسل ناکام ہوتا جا رہا تھا
راستہ کوئی رکھّا ہی نہیں تھا
اُسے تو بہت اچھا کہنے میں عمر گزار دی تھی
بُرا کیسے چاہا جاتا
اب مَیں صرف ہوا کی تخلیقی ضرورت کے علاوہ اور کچھ نہ رہ گیا تھا
سو مَیں اُسی محبّت سے
یہ ضرورتیں پوری کرتا رہا
میری بے غرض رفاقت کے پاؤں ابھی پوری طرح زخمی نہیں ہوئے تھے
ابھی شہرِ دل پوری طرح زیرِ آب نہیں آیا تھا
ہوا پھر ایک طویل عرصے کے بعد
اپنے مستقر کو لوٹ رہی تھی
ہوا کا پلٹنا بھی کمال حیرتیں لئے ہوئے تھا
ہوا کے تیور معصومانہ نہیں تھے
اُس کا اندازِ رسم و راہ یکسر تبدیل ہو کر رہ گیا تھا
یہیں میرے دل پر
ہوا کی شخصیّت کی طرف سے پہلی گرہ پڑی
مری عمر بسر کر نیوالی ہوا

انیس دسمبر ۱۹۹۷ء سردیوں کی اِک ٹھٹھرتی ہوئی شام میں "ہوا"
اپنا اعتبار کھو بیٹھی
بے قبا ہوتی ہوئی ہوا ـــــ
اپنا پندار کھو بیٹھی
اپنا کردار کھو بیٹھی
دل تو زخم زخم پہلے ہی تھا
آنکھیں بھی چھلنی ہو گئیں۔ بارشوں سے بھری ہوئی آنکھیں!
میری بے پناہ محبّت کر نیوالی آنکھوں نے
اُسے ساری زندگی آسمان کرنے والے دل نے
اُسے ایک معتبر منصب سے ہمکنار کرنے والے ذہن نے
اُسے شاعری کے خوشبودار مقام تک پہنچانے والے شاعر نے
اُسے زندگی کے زندہ مضامین سمجھانے والی حکمت نے
اُسے عزت و احترام بخشنے والی شاعری کی دیوی نے
مُنہ کے بل زمین پر گرتے دیکھا
پورا وجود ایک نادیدہ زلزلے کی لپیٹ میں آگیا
ساری کہانی بدل گئی ـــــ سارے معیار شرمندہ ہو گئے
سارا اعتبار غارت ہو گیا
جھوٹ میری زندگی میں بہت کم ہے
مَیں نے ہوا کے لئے، ہوا کی شخصیت کے لیے
زمانے سے کچھ جھوٹ ضرور بولے ہوں گے
مگر ہوا سے کبھی جھوٹ نہیں بولا ـــــ

ہوا سے جھوٹ بولنا شاید خدا سے جھوٹ بولنا لگتا تھا
مگر اس بار ہوا کا پورا وجود جھوٹ لگا
سارا یقین ـــــ گمان میں بدل گیا
حیرانی اب سینے میں خنجر پیوست کئے ہوئے ہے
میں جو سترہ برس تک ظرف اور حوصلے کا مظاہرہ کر سکتا تھا
تو ساری عُمر بھی (باقی رہ ہی کتنی گئی ہے)
ہوا کے اشارہ ابرو کا شکار رہ سکتا تھا
مگر بات اب محبّت کی نہیں ہے
مگر بات اب رفاقت کو بچانے کی نہیں ہے
بات تو
حرف کی حُرمت اور لفظ کی آبرو ـــــ کے پامال ہونے کی ہے
رفیقانہ بدعہدی کی ہے
اعتماد کی منڈیروں پر
جلتے ہوئے چراغوں پر خاک ڈالنے کی ہے
اور وفا کی آنکھوں سے بینائی چھین لینے کی ہے
میں تو یہاں بھی خاموشی کا کفن اوڑھ کر
گمنامی کی قبر میں پڑا رہتا
مگر اس بار تو ہوا نے دوستی کی ساری حدیں، سرحدیں
تباہ کر کے رکھ دیں
نئی رفاقت کا اپنا گھمنڈ تو ہوتا ہے
نہ منصب یاد رہتا ہے ـــــ نہ مقام کا پاس

نہ ماضی میں صعوبتیں جھیلنے والے یاد رہتے ہیں
نہ مستقبل میں پیش آنے والے کڑے موسموں کی زنجیریں
بس ایک غرور ـــــ اندھا غرور کچھ کر گزرنے پر اکساتا رہتا ہے
سو ۔ ہوا اس نئی "رفاقت" کے گھمنڈ میں ایک طوفان بن کر
سب سے پہلے مجھ غریب پر حملہ آور ہوئی
شاید اُسے وہ آنکھیں درکار تھیں
جنہوں نے ہوا کو بے مقام ہوتے دیکھا
میری حیرانیاں اپنی جگہ
مگر میں اپنے دوستوں کی دُعاؤں سے بچ گیا ہوں
ایک بار تو ہوا نے میرے چاروں طرف اندھیروں کی دیواریں اُٹھا دی
مگر میرے حوصلوں نے میری سچائی نے، میرے خُدا نے
میرے لفظ و بیاں کی قوّت نے، میری شاعری نے اس دیوار میں در
ڈال دی اور میں اپنی سانسیں بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا
مَیں نے کہا ناں،
کہ مَیں اپنے دوستوں کی دعاؤں سے بچ گیا ہُوں
بچ ہی نہیں گیا ، ڈٹ بھی گیا ہُوں
محبت تو غیر مشروط کی جا سکتی ہے اور کی بھی جاتی ہے
مگر ـــــ شاعر کبھی لفظ کو غیرت و حمیّت سے محروم ہاتھوں میں نہی
دے سکتا
مَیں نے بے شرط محبّت کی
اور ایثار ۔؟

ذرا کوئی مثال تو لائیں ؟
مگر میں اپنی محبت سے ہار گیا ہُوں
میرا شاعر اب مجھے تنہا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے
اور اب میں بھی تھک گیا ہوں
اس مسلسل فریب و ایثار سے
میں آپکی ۔ اپنے پڑھنے والوں کی
اور ہوا کے نام سے شائع ہونے والی شاعری کے پڑھنے والوں کے
رُو برو پیش ہو گیا ہُوں
میرے لہُو لہُو ہوتے ہوئے دل کی اس کتاب کے
بھیگے ہوئے صفحات کے دامن میں جتنے اشک ہیں
جتنے زخم ہیں
جتنی شاعری ہے
جیسی بھی شاعری ہے، محبت و ایثار کے راستوں پر بکھرے ہوئے
انسان کی شاعری ہے
ہوا کے ہاتھوں بے موت مارے جانے والے
چراغ و دماغ کی شاعری ہے
پلک سے رُوح تک بھیگے ہوئے بے نام و نشاں شاعر ـــــ کی شاعری ہے
مسترد کر دیتے جانے والے بے غرض دوست کی شاعری ہے
میں کہیں کہیں دست بردار بھی ہونا چاہتا تھا
لہٰذا اب میں تسلیم کر رہا ہُوں، میں ایک عام انسان ہُوں
مجھ سے فرشتوں والی توقعات نہ رکھی جائیں

مجھ میں اس سے زیادہ ظرف، ضبط، حوصلہ نہیں رہا
"دیکھو یہ میرے زخم ہیں"
میں جو شاعری ہے۔ وہ آپ اُن ہونٹوں سے بھی سنتے رہے ہیں
جن سے میں ادا ہوتا رہا ہوں
مگر انہی ہونٹوں کے قدموں تلے کچلے جانے والے آدمی کی شاعری
آپ کی محبت کرنے والی آنکھیں
اور آپ کا حسنِ سماعت
میرے راہ نما ہیں
آپ گفتگو، لہجے، جذبے، احساس، لفظیات، معانی کا حسن
اور طرزِ اظہار کا اندازہ خود کریں گے
میں تو خواب میں چلنے والا شاعر ہوں
جو آنکھیں موندے ـــــ اپنی محبت کے تعاقب میں چلا جا رہا تھا
مجھے تو یہ بھی خبر نہیں ہے
کہ "اظہاریہ" کس اسلوب میں ادا ہو رہا ہے
مَیں اپنی ذات میں تھا بھی کب!
اور اب جب پندار زخمی ہوا ہے تو خود کو تلاش کر رہا ہوں
گم ہو جانے والے کو خود کو تلاش کرنے کا حق تو ملنا چاہیئے نا
دُعا کریں
مَیں خود کو مکمل تلاش کر سکوں
خزاں کی اپنی حیرت ہے، یہ حیرت مار دیتی ہے
اگر حد سے زیادہ ہو محبت، مار دیتی ہے

مُنوّر جمیل

نعت

نعت لکھنے کا اگر مجھ کو قرینہ آجائے
جتنا دُشوار ہو جینا مجھے جینا آجائے

ڈوبنے والو! کبھی دل سے پکارو تو انہیں
خود بھنور لے کے کنارے پہ سفینہ آجائے

ایسی رحمت کی گھڑی بھی کوئی آسکتی ہے
میں مدینے میں رہوں مجھ میں مدینہ آجائے

مجھ گنہگار بھکاری کی یہی جنّت ہے
اُن کی نسبت کا مرے ہاتھ خزینہ آجائے

اُس سفر میں کبھی تھکتے نہیں دل اور پاؤں
جس سفر میں کہیں احساسِ مدینہ آجائے

ہو تو سکتا ہے اگر آپ کرم فرما دیں
میری آنکھوں سے مرے دل میں مدینہ آجائے

نعت

بہ احتیاطِ عقیدت بہ چشمِ تر کہنا
صبا حضور سے حالِ دل و نظر کہنا

حصارِ جبر میں ہوں اور یہاں سے اب ہجرت
میں جانتا ہوں کہ ممکن نہیں مگر کہنا

میں خاکِ شہرِ مدینہ پہن کے گر نکلوں
تو مجھ سے بڑھ کے کوئی ہوگا معتبر کہنا

یہ عرض کرنا کہ آقا مری بھی سُن لیجے
بجز تمہارے نہیں کوئی چارہ گر کہنا

میں اپنی پلکوں سے لکھتا ہوں حرفِ نامِ رسولؐ
مجھے بھی آگیا لکھنے کا اب ہنر کہنا

یہ کہنا اب تو ہمیں تاب انتظار نہیں
کہ ہم کریں گے مدینے کا کب سفر کہنا

نعت

زندگی کو حُسن کا اِک زاویہ دیتا ہے وُہ
اُس کے دَر سے مانگئے بے انتہا دیتا ہے وُہ

منزلوں کی راہ میں سچے مسافر کو اگر!
رات پڑ جائے تو قندیلیں جلا دیتا ہے وُہ

تم کبھی دیکھو تو اس کی سمت دل کی آنکھ سے
بہتے دریاؤں میں بھی رستے بنا دیتا ہے وُہ

کیا تدبّر ہے کہ راہِ حق پہ لانے کے لئے
اپنے دشمن کو بھی موقع بارہا دیتا ہے وُہ

اسمِ احمدؐ

اُسے پکاریں
کہ جس کی آہٹ، سبھی زمانوں
میں گونجتی ہے
اُسی کو لکھیں کہ جس کا اسمِ عظیم لکھنے سے
لفظ کو رنگ، رنگ کو خوشبوئیں ملی ہیں
محبّتوں کو زباں ملی ہے
شفیق لہجوں
عظیم سوچوں
یقین و عزم و عمل کو اظہار کا سلیقہ
خزاں رُتوں کو

بہار کا پیرہن ملا ہے
اندھیری راتوں کو چاند کی روشنی کا
اذنِ جمال بخشا گیا اَبد تک
زمانے بھر سے عداوتوں کے،
جہالتوں کے جو سلسلے تھے،
مٹا دیئے ہیں
اُسی کو چاہیں کہ جس کی چاہت اَبد نشاں ہے
وہ اسمِ احمدؐ جو سائباں ہے
وہی محبّت تو جاوداں ہے
اُسے پکاریں کہ جس کی آہٹ
سبھی زمانوں میں گونجتی ہے!

میں جب سے تیرے ہجر کے دُکھ سہنے لگا ہُوں
پہلے سے بہت اچھی غزل کہنے لگا ہُوں

○

نظر عذابوں میں گھِر گئی ہے، سخن سرابوں میں آگیا ہے
سُنا ہے اب کے بہار موسم، خزاں کی باتوں میں آگیا ہے

یہ کیا غضب ہے کہ جس نے عہدِ بہار چاہا نہ عشق دیکھا
نظامِ ہجر و وصال سارا اُسی کے ہاتھوں میں آگیا ہے

بہار تو اِک مغالطہ ہے، خزاں کی رُوپوشش حیرتوں کا
جو اِس طلسمِ جہاں سے گذرا، وہ داستانوں میں آگیا ہے

وہ جس کے دامن میں شاعری تھی بہار لہجے کی لُٹ لُٹا کر
اے ربِّ لفظ و بیاں وہ شاعر، تری پناہوں میں آگیا ہے

بہار کیا اب خزاں بھی دیکھے، غرورِ حسنِ سخنوری میں
جو آسمانوں پہ جا بسا تھا، زمیں کے قدموں میں آگیا ہے

بہار رُت میں بچھڑ کے تجھ سے جو دِل پہ گذری وہ دل ہی جانے
ہمیں تو اتنا پتہ ہے یارو، لہو تک آنکھوں میں آگیا ہے

○

یہ دُوریوں میں لمحۂ وصال کیسے آگیا
تمھیں ہمارے شہر کا خیال کیسے آگیا

ابھی تو طے ہوئے نہ تھے اصول آشنائی کے
ابھی سے دل کے آئینے میں بال کیسے آگیا

کوئی تو بھید ہم پہ بھی کھُلے ترے عروج کا
کبھی تو ہم بتا سکیں زوال کیسے آگیا

چلے تھے تم تو چاہتوں کی سیپیاں تلاشنے
تمھارے ہاتھ نفرتوں کا جال کیسے آگیا

گلاب رُت گذر چکی، مگر یہ شہرِ ہجر میں
ہوا کے ہاتھ خوشبوؤں کا تھال کیسے آگیا

ہماری عُمر لگ گئی ہمیں تو ڈھب نہ آسکا
تمھیں یہ عرضِ حال کا کمال کیسے آگیا

محبتوں میں شرط کی تو کوئی بات ہی نہ تھی
یہ درمیاں اناؤں کا سوال کیسے آگیا

○

سرِ شام جب بھی دیا جلا تو خیال تیری طرف گیا
کوئی تازہ بابِ سخن کھلا تو خیال تیری طرف گیا

کسی اجنبی سے دیار میں، کسی بے کسی کے غبار میں
کوئی اپنے شہر کا مل گیا تو خیال تیری طرف گیا

کوئی شام دل کو بھلی لگی تو زمیں ستاروں سے بھر گئی
کہیں چاند ابر میں چھپ گیا تو خیال تیری طرف گیا

مرے ہم سفر تو نہیں تھے وہ، مرے ہم سخن بھی نہیں تھے وہ
مجھے راستے میں پتہ چلا، تو خیال ــــ تیری طرف گیا

جو ترے خلاف لکھی گئی، وہ کتاب دِل نے پڑھی نہیں
بہت اچھا شعر کہیں سُنا تو خیال تیری طرف گیا

○

کسی کے ہونٹوں پہ گرچہ روشن کوئی بھی حرفِ دُعا نہیں ہے
مگر چراغِ ہُنر ہمارا ، اِن آندھیوں میں بجھا نہیں ہے

بچھڑ رہے ہو تو شوق سے اِک علیٰحدہ رستہ بناؤ لیکن
مسافتوں میں اکیلے پن کا، عذاب تم نے سہا نہیں ہے

ہمیں تو صحرا کی وسعتوں سے تھی ایک نسبت، سو آج بھی ہے
مگر وہ دریا صفت مُسافر جو ایک پل بھی رُکا نہیں ہے

یہ عُمر جس کے تقاضے کرتی، گزرتی جاتی ہے زندگی سے
وہ حرف اُس نے کتابِ دل کے کسی ورق پر لکھا نہیں ہے

یہی بہت ہے ہمارے جذبوں، ہماری بے لوث دوستی کا
یہ شہر دشمن ہے اور دشمن ہمارے قد سے بڑا نہیں ہے

○

پرائی خواہش کی پاسبانی سے بچ گیا ہوں
بچھڑ کے تجھ سے میں رائیگانی سے بچ گیا ہوں

مجھے بھی دُکھ ہے تری جدائی کا دوست لیکن
میں اِک مسلسل غلط بیانی سے بچ گیا ہوں

مرے بزرگوں کا حال یہ تھا کہ مار دیتے
میں اپنے بچوں کی مہربانی سے بچ گیا ہوں

مجھے تو گرداب صحبتِ جہل لے گیا تھا
اے موجِ دانش تری روانی سے بچ گیا ہوں

ہزار خنجر مرے تعاقب میں وہم کے تھے
میں اپنی فطرت کی بے دھیانی سے بچ گیا ہوں

○

یہاں لوگوں نے زر کے واسطے کیا کیا نہیں چھوڑا
مگر ہم نے کبھی اپنا لب و لہجہ نہیں چھوڑا

مرے کردار سے پہچان تھی جس کی اُسی گھر نے
مجھے برباد کرنے کا کوئی حربہ نہیں چھوڑا

وہ موسم کے بدلتے ہی اکیلا کر گیا مجھ کو
کسی بھی موڑ پر میں نے جسے تنہا نہیں چھوڑا

یہاں اِک اور بھی سچ بولتا تھا، پیار کرتا تھا
مگر اِس شہر نے اُس شخص کو زندہ نہیں چھوڑا

یہ کیسا شوق تھا لوگوں کو دیواریں اُٹھانے کا
گھروں سے باہر آنے کا، کوئی رستہ نہیں چھوڑا

○

کسی بہانے، کسی کے سبب سے چاہتا تھا
وہ شہر چھوڑ کے جانا تو کب سے چاہتا تھا

یہاں بھی لوگ تھے اس کے مزاج کے لیکن
وہ زندگی کو ذرا اور ڈھب سے چاہتا تھا

سخن کا تاج زمیں دل کی سونپ دی اُس کو
وہ اور کیا مرے ظرف و نسب سے چاہتا تھا

میں خالی ہاتھ سہی تو گریز پا کیوں تھا
میں جو بھی چاہتا تھا اپنے رب سے چاہتا تھا

غرورِ قامت و قد جب سے ہو چلا تھا۔ اُسے
مرے ہنسنے سے مکرنا وہ تب سے چاہتا تھا

اب اُس کی سمت نہ دیکھوں اور اُس کی بات کروں
وہ اتنی بات مری چشم و لب سے چاہتا تھا

وہ رات رنگ سی آنکھیں وہ شام رنگ نقوش
مرے نہیں رہے لیکن میں کب سے چاہتا تھا

○

یہ نہیں، گر پڑی دیوار ہی سر پر میرے
کر دیئے کھیت بھی سیلاب نے بنجر میرے

جب سے ڈوبا ہوں تری یاد کے صحراؤں میں
خشک ہوتے نہیں آنکھوں کے سمندر میرے

تیری شہرت کی کتابیں تو سرِ عام بکیں
جب سے رسوائی کے چرچے ہوئے گھر گھر میرے

کیسا جھوٹا ہوں کہ ہر بات پہ ہنس دیتا ہوں
کتنا سچا ہوں کہ سو زخم ہیں اندر میرے

جس کی آنکھوں کے کبھی مجھ پہ نہ دَر باز ہوئے
دستکیں دیتا رہا رات وہ گھر پر میرے

میں بھی اخلاص کی زنجیر لیے پھرتا ہوں
وہ بھی رہتا ہے تعاقب میں برابر میرے

دشتِ تنہائی میں جب تجھ کو مقابل پاؤں
ٹوٹنے لگتے ہیں جذبات کے پیکر میرے

اِک محبّت ہی نہیں میرے گناہوں میں جلیل
سانس لینے کا بھی الزام ہے سر پر میرے

○

دل نے ترے بارے میں پوچھا تو بہت رویا
وہ شخص جو پتھر تھا ٹوٹا تو بہت رویا

یہ دل کہ جُدائی کے عنوان پہ برسوں سے
چُپ تھا تو بہت چُپ تھا، رویا تو بہت رویا

اِک حرفِ تسلّی کا — اِک لفظ محبّت کا
خود اپنے لئے اُس نے لکھّا تو بہت رویا

پہلے بھی شکستوں پر کھائی تھی شکست اُس نے
لیکن وہ ترے ہاتھوں ہارا تو بہت رویا

جو عہد نبھانے کی دیتا تھا دُعا، اُس نے
کل شام مجھے تنہا دیکھا تو بہت رویا

○

اک یہ نہیں کہ کُھل کے کبھی رو نہیں سکا
پچھلے کئی مہینوں سے میں سو نہیں سکا

وہ ساتھ تھا تو منزلیں قدموں کی گرد تھیں
پھر اُس کے بعد ایسا سفر ہو نہیں سکا

پچھلے برس بھی کھیت مرے جل جلا گئے
اِس بار بھی میں فصلِ وفا بو نہیں سکا

پھر اُس کے بعد دل نے بہت احتیاط کی
لیکن جو داغ لگ چکا وہ دھو نہیں سکا

○

مجھ کو رسوا سرِ محفل تو نہ کروایا کرے
کاش آنسو مری آنکھوں میں ہی رہ جایا کرے

اے ہَوا! مَیں نے تو بس اس کا پتہ پوچھا تھا
اَب کہانی تو نہ ہر بات کی بن جایا کرے

اِک مصیبت تو نہیں ٹوٹی سو اَب اس دل سے
جس قیامت نے گزرنا ہے گزر جایا کرے

دِل نے تو سوچ لیا ہے کہ یہ ظالم دُنیا
جو بھی کرنا ہے کرے مجھ کو نہ اُلجھایا کرے

بس بہت دیکھ لیے خواب سہانے دن کے
اب وہ باتوں کی رفاقت سے نہ بہلایا کرے

جس کے خوابوں کو میں آنکھوں میں سجا کر رکھوں
اُس کی خوشبو کبھی مجھ کو بھی تو مہکایا کرے

○

نہیں کہ تیری محبت پہ اعتبار نہ تھا
مجھے خود اپنی طبیعت پہ اختیار نہ تھا

ہم ایک عُمر بس اتنا ہی ساتھ ساتھ رہے
مجھے یقین نہ تھا اُس کو اعتبار نہ تھا

تم آ گئے تو ذرا ٹل گیا تھا موسمِ غم
دگرنہ کب مرے رستوں میں یہ غبار نہ تھا

وہ کیسے لوگ تھے نامتفق سی خُو والے
کہ جن کو اپنے خدا پر بھی اعتبار نہ تھا

میں تھک گیا تو وہی شخص میرے کام آیا
جو ہم سفر نہ تھا، جس کا کہیں شمار نہ تھا

ہمیں بھی خوف سے تیرے خلاف ہونا پڑا
کہ ایسی صورتِ حالات سے فرار نہ تھا

غضب کی دھوپ تھی تنہائیوں کے جنگل میں
کئی شجر تھے مگر کوئی سایہ دار نہ تھا

○

کسی کی بات ہو، لہجہ اُسی کا لگتا ہے
یہ شہر سارے کا سارا اُسی کا لگتا ہے

یہ زندگی بھی تو اِک دشتِ بے اماں ہے جہاں
جو صبر والا ہو، خیمہ اُسی کا لگتا ہے

گلاب رُت میں بھی خوشبو اُسی کی لگتی ہے
ہو چاند رات تو چہرہ اُسی کا لگتا ہے

ہو جس کی پیاس سے دریا و دشت شرمندہ
پھر اُس کے بعد تو دریا، اُسی کا لگتا ہے

ہم اہلِ فکر ہیں غالب کو ماننے والے
ہمیں تو سارا زمانہ اُسی کا لگتا ہے

مہکتی شام کا منظر بتا رہا ہے جمیل
یہ رنگ اُس کے، یہ رستہ اُسی کا لگتا ہے

○

تجھ سے اَب اور محبت نہیں کی جائے گی
خود کو اتنی بھی اذیت نہیں دی جائے گی

یہ بھی مانا کہ یقیں ٹوٹ رہا ہے خود پر
پھر بھی اب ترک یہ وحشت نہیں کی جائے گی

اَب تو اس شہرِ خرابی سے نکلنا ہے جہاں
سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی جائے گی

روشنی دل میں اُترتی ہے تو ڈرنا کیسا
شب سے کوئی بھی اجازت نہیں لی جائے گی

○

آنکھوں سے چھلکتا ہوا پانی کہاں لے جاؤں
اے شہر تری دردنشانی کہاں لے جاؤں

بے شک دلِ خوش فہم کہیں روک لے مجھ کو!
لیکن میں طبیعت کی روانی کہاں لے جاؤں

خوشبو کو سفر سے میں بھلا کس طرح روکوں
جو دل میں کھلے رات کی رانی کہاں لے جاؤں

خوش ہو کے بچھڑ جا مگر اے زود فراموش
جو دل میں چھپا ہے ترا ثانی کہاں لے جاؤں

جب شام کے آنگن میں ٹھہر جائے اُداسی
ایسے میں تری یاد پرانی کہاں لے جاؤں

○

تیری محبّت کے یہ خواب
آنے لگا ہے خود سے حجاب

ساری عمر کا سرمایہ ہیں
ایک چراغ اور ایک کتاب

تجھ سے محبّت کرتے رہنا
میرا سب سے بڑا عذاب

ہجر کی سو دیواریں ہیں
وصل کے اپنے باغ گلاب

تم بھی پوچھ رہے ہو، اب
تنہا رہنے کے اسباب

آنکھیں پتھر ہوتی ہیں
مت دیکھا کر ایسے خواب

دل کی ہتھیلی پر رکھا
تیری یاد کا سُرخ گلاب

لکھتے ہوئے مر جاتے ہیں
لوگ وفا کی ایک کتاب

○

حصارِ لفظ و بیاں میں گُم ہوں
ابھی اُسی داستاں میں گُم ہوں

میں دیکھ سکتا حریف کو بھی
مگر صفِ دوستاں میں گُم ہوں

بدن کا اپنا عذاب ہے اور
اسی عذابِ زیاں میں گُم ہوں

یہ لوگ گھر کہہ رہے ہیں جس کو
میں ایک ایسے مکاں میں گُم ہوں

کہاں وہ لذّت مسافتوں کی
میں منزلوں کے نشاں میں گم ہوں

مہک نے رستے بدل لیے ہیں
بہار تھی اب خزاں میں گم ہوں

تپش میں جو دُھوپ سے سوا ہے
دُکھوں کے اُس سائباں میں گم ہُوں

○

میری آنکھوں کو سوجھتا ہی نہیں
یا مقدر میں راستہ ہی نہیں

وہ بھرے شہر میں کسی سے کبھی
میرے بارے میں پوچھتا ہی نہیں

پھر وہی شام ہے وہی ہم ہیں
ہاں مگر دل میں حوصلہ ہی نہیں

ہم چلے اُس کی بزم سے اُٹھ کر
اور وہ ہے کہ روکتا ہی نہیں

دِل جو اک دوست تھا مگر وہ بھی
چپ کا پتھر ہے بولتا ہی نہیں

میں تو اُس کی تلاش میں گُم ہوں
وہ کبھی مجھ کو ڈھونڈتا ہی نہیں

○

کیا کہیں تم سے کہ کیسے حوصلہ ہم نے کیا
شہر کو جب چھوڑنے کا فیصلہ ہم نے کیا

ایک منظر شام کا اور شام بھی تنہائی کی
ایسے عالم میں بھی کب تم سے گِلہ ہم نے کیا

شہر سارا بہہ چلا تھا نیند کے سیلاب میں
وہ تو کہیے جاگنے کا حوصلہ ہم نے کیا

ہو گئے تیار پھر سے تازہ ہجرت کے لیے
حل تمہارے شہر کا بھی مسئلہ ہم نے کیا

ہر طرف اِک اختلافِ رائے کا طوفان ہے
ترک جب سے خامشی کا سلسلہ ہم نے کیا

○

اشک اپنی آنکھوں سے خود بھی ہم چھپائیں گے
تیرے چاہنے والے شور کیا مچائیں گے

صبح کی ہوا تجھ کو وہ ملے تو کہہ دینا
شام کی منڈیروں پر ہم دیئے جلائیں گے

ہم نے کب ستاروں سے روشنی کی خواہش کی
ہم تمہاری آنکھوں سے شب کو جگمگائیں گے

تجھ کو کیا خبر جاناں ہم اُداس لوگوں پر
شام کے سبھی منظر انگلیاں اٹھائیں گے

ہم تری محبت کے جگنوؤں کی آمد پر
تتلیوں کے رنگوں سے راستے سجائیں گے

○

خیال و خواب کی لمبی مسافتوں سے بچا
تھکی تھکی ہوئی آنکھوں کو رت جگوں سے بچا

جو رکھ سکیں نہ بھرم لفظ کی صداقت کا
مرے خدا مجھے ایسے سخن وروں سے بچا

جو شب کو قتل کریں، دن کو معتبر ٹھہریں
عدیلِ شہر ہمیں ایسے رہبروں سے بچا

اگر بچانا ہی مقصود ہے تو جانِ غزل
محبتوں کے مسافر کو ہجرتوں سے بچا

میں تیرا ساتھ بہت دور تک نبھاؤں گا
مگر یہ شرط ہے۔ خود کو اداسیوں سے بچا

بہت گریز کیا اُس کے ساتھ رہنے سے
مگر جمیل کہاں اُس کی خوشبوؤں سے بچا

○

صحرا میں دو آنکھیں تھیں، اِک پیڑ خزانہ تھا
منظر ٹوٹ بھی سکتا تھا، پر عکس پرانا تھا

باقی کام تو اُن کا تھا جو ساحل ساحل تھے
ہم نے تو بس ڈوبتے ڈوبتے ہاتھ ہلانا تھا

بھیگتی آنکھیں لے کر جب وہ گھر تک آ پہنچا
نہ ملتے تو کیا کرتے، وہ دوست پرانا تھا

اب تم اس کی چھاؤں میں بیٹھو یا شاخیں کاٹو
ہم نے تو بس صحرا میں اک پیڑ لگانا تھا

اس بستی میں اک پیپل تھا اور پیپل کے تلے
اک گھر تھا اور اس گھر میں مرا آنا جانا تھا.....!

اُس کی ہار بھی اپنے۔ دل میں گھاؤ ڈال گئی
ہم نے بازی جیت کے بھی کیا شور مچانا تھا

سُنو مسافر، اچھا چھوڑو بات پرانی ہے
ہم تُم کچھ دن ساتھ رہے تھے یاد دلانا تھا

فیصلہ

میرے ہاتھ پر لکھ دو
فیصلہ جدائی کا
اتنا مختصر لکھنا
جتنی تم نے مجھ جیسے
کم نصیب شاعر سے
مختصر محبت کی
اتنا مختصر لکھو
فیصلہ جدائی کا

جتنی مجھ میں سانسیں ہیں
جتنی میری ہستی ہے
جس میں آج سے پہلے
وصل کے گلابوں کی روشنی مہکتی تھی
فیصلہ جدائی کا اب طویل مت لکھنا
جس طرح مری چاہت
جس طرح مری خواہش
فیصلہ جدائی کا گر طویل لکھو گی
تب میں پڑھ نہ پاؤنگا
میں تو اب جدائی کے فیصلے کو پڑھنے تک
زندگی کا ساتھی ہوں
زندگی تمھاری ہے

معذرت

کوئی نظم کیسے کہیں کہ ہم
نہ چراغ ہیں
نہ مثالِ حرفِ گلاب ہیں
نہ خیال ہیں
نہ کسی کی آنکھ کا خواب ہیں
کسی گم شدہ سی وفاؤں کی
کسی شام میں
جو بچھڑ گئے
تو بچھڑنے والوں کی یاد میں

کہیں ریت ہیں
کہیں اشکِ غم کا غبار ہیں
وہ جو دشت
ہجر کا ہے کہیں
اِسی دشتِ شامِ جدائی کے
یہ جو داغ ہیں
تری یاد کے
ترے بعد کے
کوئی نظم کیسے کہیں کہ ہم
نہ چراغ ہیں
نہ مثالِ حرفِ گلاب ہیں
نہ خیال ہیں
نہ کسی کی آنکھ کا خواب ہیں
یہ جو شہر ہے
تو یہ شہر بھی
صفِ دشمناں سے ملا ہوا

یہ جو لوگ ہیں
تو یہ لوگ بھی
کہاں جانتے ہیں کہ کیا ہوا
کوئی نظم کیسے کہیں
کہ ہم
یہ فضا ہی ایسی نہیں رہی
جو چراغ کوئی جلائیں ہم
تو ہوا ہی ایسی
نہیں رہی
تہی فکر ایسے ہوئے ہیں ہم
ترے خال و خد کا بیاں بھی اب
نہ ہمارے دستِ ہنر میں تھا
نہ ہمارے دستِ ہنر میں ہے

نظم

اپنے دِل کی مُٹھیوں کو
کھول کر دیکھو ذرا

اِن میں
میری خواہشوں کے
کتنے جگنو
قید ہیں

○

زمین پر ہے مگر آسمان لگتا ہے
یہ کون ہے جو مجھے مہربان لگتا ہے

میں لاکھ چاہوں مگر مجھ کو بھولنے والا
کبھی کبھی تو مرے دل سے آن لگتا ہے

ہَوا کچھ ایسی چلی ہے کہ ان دنوں وہ بھی
مِری طرف سے بہت بدگمان لگتا ہے

یہ سارا شہر اُسی کے سبب سے زندہ ہے
جو شخص تجھ کو بہت بے نشان لگتا ہے

وہی ہے شہر وہی خوشبوؤں کی بارش ہے
وہی گلی ہے اُسی کا مکان لگتا ہے

○

چُپ نہ رہتے بیان ہو جاتے
تجھ سے گر بدگمان ہو جاتے

ضبطِ غم نے بچا لیا ورنہ
ہم کوئی داستان ہو جاتے

تُو نے دیکھا نہیں پلٹ کے ہمیں
ورنہ ہم مہربان ہو جاتے

تیرے قصّے میں ہم بھلا خود سے
کس لیے بدگمان ہو جاتے

تیرے دل کی زمین ہی نہ ملی
ورنہ ہم آسمان ہو جاتے

○

یہ دِل بُھلاتا نہیں ہے محبّتیں اُس کی
پڑی ہوئی تھیں مجھے کتنی عادتیں اُس کی

یہ میرا سارا سفر اُس کی خوشبوؤں میں کٹا
مجھے تو راہ دکھاتی تھیں چاہتیں اُس کی

گھرا ہُوا ہوں میں چہروں کی بھیڑ میں لیکن
کہیں نظر نہیں آتیں شباہتیں اُس کی

میں دُور ہونے لگا ہوں تو ایسا لگتا ہے
کہ چھاؤں جیسی تھیں مجھ پر رفاقتیں اُس کی

یہ کس گلی میں یہ کس شہر میں نکل آئے
کہاں پہ رہ گئیں لوگو صداقتیں اُس کی

مَیں بارشوں میں جُدا ہو گیا ہوں اُس سے مگر
یہ میرا دِل مری سانسیں امانتیں اُس کی

○

بدن نڈھال ہے، آنکھوں میں خواب زندہ ہیں
ترے خیال کے سب آفتاب زندہ ہیں

محبتوں کا وہی دشت ہے، مسافت ہے
لبوں پہ پیاس سلامت، سُراب زندہ ہیں

رفاقتوں میں ابھی اتنی خامشی بھی نہیں
ترے سوال، مرے سب جواب زندہ ہیں

یہ موسموں سے بھلا بدگمانیاں کیسی
ابھی تو خار ہیں باقی، گلاب زندہ ہیں

مرے خیال کے منظر میں کس لیے اب بھی
ترے تمام گناہ و ثواب زندہ ہیں

○

یہ میری عمر مرے ماہ و سال دے اُس کو
مرے خدا مرے دُکھ سے نکال دے اُس کو

وہ چُپ کھڑا ہے کئی دن سے تیری خاطر تُو
کواڑ کھول دے اذنِ سوال دے اُس کو

عذابِ بدنظری کا جسے شعور نہ ہو
یہ میری آنکھیں، مرے خدوخال دے اُس کو

یہ دیکھنا شبِ ہجراں کہ کس کی دستک ہے
وصال رُت ہے اگر وہ تو ٹال دے اُس کو

وہ جس کا حرفِ دُعا روشنی ہے میرے لیے
میں بُجھ بھی جاؤں تو مولا اُجال دے اُس کو

○

مرے رستے میں اِک دیوار باقی ہے ابھی تک
کہانی میں ترا کردار باقی ہے ابھی تک

سفر کی ساری شرطیں طے ہوئیں لیکن کہیں پر
دِلوں میں وحشتِ انکار باقی ہے ابھی تک

بچھڑنے سے ذرا پہلے تک اُس کو خوب دیکھا
تو پھر کیوں حسرتِ دیدار باقی ہے ابھی تک

یہ آنکھیں راہ تکتے تکتے پتھر ہو گئی ہیں
پسِ دیوار اِک اصرار باقی ہے ابھی تک

کئی یادیں، کئی باتیں بھلا ڈالی ہیں دل نے
مگر اک شخص خوشبو دار باقی ہے ابھی تک

نہیں گزرا جسے طوفاں کی صورت تھا گزرنا
سروں پر خوف کی تلوار باقی ہے ابھی تک

○

آئندہ کبھی اُس سے محبت نہیں کی جائے
کی جائے تو پھر اُس کی شکایت نہیں کی جائے

اس معرکۂ عشق میں اے اہلِ محبت
آساں ہے عداوت پہ عداوت نہیں کی جائے

یہ دل کہ اُسی زود فراموش پہ مائل
اور ذہن بضد اُس سے محبت نہیں کی جائے

ہم اہلِ سخن ہیں تو روایت کے مطابق
مصلوب کیا جائے رعایت نہیں کی جائے

یہ لوگ تماشا ہیں تو پھر ان سے جنوں میں
کوئی بھی بیاں دل کی حکایت نہیں کی جائے

یہ بھی تو ہے اِک جُرم کہ ظالم کے مقابل
خاموش رہا جائے مذمت نہیں کی جائے

○

دل تھا کہ خوش خیال تجھے دیکھ کر ہوا
یہ شہر بے مثال تجھے دیکھ کر ہوا

اپنے خلاف شہر کے اندھے ہجوم میں
دل کو بہت ملال تجھے دیکھ کر ہوا

طولِ شبِ فراق تری خیر ہو کہ دل
آمادۂ وصال تجھے دیکھ کر ہوا

یہ ہم ہی جانتے ہیں جدائی کے موڑ پہ
اس دل کا جو بھی حال تجھے دیکھ کر ہوا

آئی نہ تھی کبھی مرے لفظوں میں روشنی
اور مجھ سے یہ کمال تجھے دیکھ کر ہوا

بچھڑے تو جیسے ذہن معطل سا ہو گیا
شہرِ سخن بحال تجھے دیکھ کر ہوا

پھر لوگ آ گئے میرا ماضی کریدنے
پھر مجھ سے اِک سوال تجھے دیکھ کر ہوا

○

اِک پشیمان سی حسرت سے مجھے سوچتا ہے
اب یہی شہرِ محبت سے مجھے سوچتا ہے

میں تو محدود سے لمحوں میں ملا تھا اُس سے
پھر بھی وہ کتنی وضاحت سے مجھے سوچتا ہے

میں تو مر جاؤں اگر سوچنے لگ جاؤں اُسے
اور وہ کتنی سہولت سے مجھے سوچتا ہے

جس نے سوچا ہی نہ تھا ہجر کا ممکن ہونا
دُکھ میں ڈوبی ہوئی حیرت سے مجھے سوچتا ہے

کتنا خوش فہم ہے وہ شخص کہ ہر موسم میں
اِک نئے رُخ، نئی صورت سے مجھے سوچتا ہے

گرچہ اب ترکِ مراسم کو بہت دیر ہوئی
اب بھی وہ کتنی وضاحت سے مجھے سوچتا ہے

○

اب کس سے کہیں اور کون سنے جو حال تمہارے بعد ہوا
اس دل کی جھیل سی آنکھوں میں اک خواب بہت برباد ہوا

اس شہر میں کتنے چہرے تھے، کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اِک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا

یہ ہجر ہوا بھی دشمن ہے اُس نام کے سارے رنگوں کی
وہ نام جو میرے ہونٹوں پر خوشبو کی طرح آباد ہوا

وہ اپنے گاؤں کی گلیاں تھیں دل جن میں ناچتا گاتا تھا
اب اس سے فرق نہیں پڑتا ناشاد ہوا یا شاد ہوا

بے نام ستائش رہتی تھی ان گہری سانولی آنکھوں میں
ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا دل اب جیسا بیداد ہوا

○

کون بھنور میں ملاحوں سے اب تکرار کرے گا
اب تو قسمت سے ہی کوئی دریا پار کرے گا

سارا شہر ہی تاریکی پر یوں خاموش رہا تو
کون چراغ جلانے کے پیدا آثار کرے گا

جب اس کا کردار تمہارے سچ کی زد میں آیا
لکھنے والا شہر کی کالی ہر دیوار کرے گا

جانے کون سی دُھن میں تیرے شہر میں آ نکلے ہیں
دل تجھ سے ملنے کی خواہش اب سو بار کرے گا

دِل تو ترا ہی گھر تھا لیکن اب یہ کسے خبر تھی
درد بھی اپنے ہونے پر اتنا اصرار کرے گا

○

آسماں پر واہموں کا اِک خلا موجود ہے
پھر بھی دل کو ہے یقیں اب تک خدا موجود ہے

وہ تو رزقِ شب ہُوا، پَر قاتلانِ صبح میں
اُس کے ہونے کا ابھی تک خوف سا موجود ہے

سازشوں کا ذِکر کیا اب شہر والوں سے کروں
یہ مرے اپنے قبیلے میں دَبا موجود ہے

کتنے دھیمے لہجے سے اُس نے کہا تھا الوداع
میرے کانوں میں ابھی تک وہ صدا موجود ہے

○

شکستہ حال ہوں دِل سے بُھلا نہ دینا مجھے
تُم اپنے پیار کی، ایسی سزا نہ دینا مجھے

بڑے ہی پیار سے دیکھا ہے رات تم نے مجھے
یہ خواب ہے تو خدارا، جگا نہ دینا مجھے

میں داغِ شامِ اَلم ہوں مگر تمھارے لیے
چراغ بن کے جلا ہوں بُجھا نہ دینا مجھے

نشاطِ درد کے گہرے سمندروں میں کبھی
اگر میں ڈوب گیا، پھر صدا نہ دینا مجھے

شعر

پرائے شہر میں تیری جُدائی کا موسم
نجانے رکھے گا کب تک یہ، آبدیدہ مجھے

○

عجیب وہم سے اب کے دِلوں میں بیٹھ گئے
عدُو سے ڈر کے سبھی خندقوں میں بیٹھ گئے

جنھیں پناہ ملی دل شجر کی چھاؤں میں
وُہ زہر بن کے اُسی کی جڑوں میں بیٹھ گئے

بتا اے خالقِ کون و مکاں ، کدھر جائیں
وہ لوگ جن کے مکاں ، بارشوں میں بیٹھ گئے

تمھیں تو مجھ سے محبت تھی دوستوں کی طرح
یہ کیا کہ تم بھی مرے دشمنوں میں بیٹھ گئے

عذاب جو بھی سہا میں نے اپنی جاں پہ سہا
یہ لوگ کس لئے چھُپ کر گھروں میں بیٹھ گئے

یہ لوگ آپ سے انصاف کیا کریں گے جمیل
تعصبات کی جو محفلوں میں بیٹھ گئے

○

اپنے لہو سے فصل اُگانے والا میں
دیواروں پر نقش بنانے والا میں

اب سائے کی اُنگلی تھام کے چلتا ہوں
کم نظروں کو راہ دکھانے والا میں

ترس گیا ہوں اپنے خواب کی شکلوں کو
لوگوں کو تعبیر بتانے والا میں

خاموشی کی چادر اوڑھ کے بیٹھا ہوں
گلی گلی آواز لگانے والا میں ــــ!

سارے شہر میں ہنستا کھیلتا پھرتا ہوں
تنہائی میں اشک بہانے والا میں

غم کا سُورج دِل میں چھپائے پھرتا ہوں
جگنو پکڑ کر شور مچانے والا میں

دستک

تمام منظر بدل رہا ہے
بہار موسم
تمام رنگوں
ہزار پھولوں سے
زندگی کے اداس رستے سجا رہا ہے
یہ شام کتنی مہک رہی ہے
یوں لگ رہا ہے
کہ خوشبو ـــــ خوشبو سے
گفتگو کے چراغ چہرے بنا رہی ہے
بہار کی رُت
گلاب ہونٹوں پہ
اپنی غزلوں کے شعر
لکھ لکھ کے رکھ رہی ہے
تمام منظر بدل رہا ہے

خواب و خط کے جلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
راکھ کے بکھرنے میں دیر کتنی لگتی ہے

ہم تو خواب والے تھے نیند میں رہے برسوں
ورنہ آنکھ کھلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

ہجر کی تمازت سے وصل کے الاؤ تک
لڑکیوں کے جلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

بات جیسی بے معنی بات اور کیا ہوگی
بات سے مکرنے میں دیر کتنی لگتی ہے

زعم کتنا کرتے ہو اِک چراغ پر اپنے
اور ہَوا کے چلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

جب یقیں کی بانہوں پر شک کے پاؤں پڑ جائیں
چوڑیاں بِکھرنے میں دیر کتنی لگتی ہے

○

گریزِ شب سے سحر سے کلام رکھتے تھے
کبھی وہ دن تھے کہ زلفوں میں شام رکھتے تھے

ہمیں بھی گھیر لیا گھر کے زعم نے تو کھُلا
کچھ اور لوگ بھی اس میں قیام رکھتے تھے

یہ اور بات ہمیں دوستی نہ راس آئی
ہَوا تھی ساتھ تو خوشبو مقام رکھتے تھے

تمہارے ہاتھ لگے ہیں تو جو کرو سو کرو
وگرنہ تم سے تو ہم سو غلام رکھتے تھے

نجانے کون سی رُت میں بچھڑ گئے وہ لوگ
جو اپنے دل میں بہت احترام رکھتے تھے

کچھ ایسے گھر بھی تھے شہرِ ستمگراں جن کے
نہ در کھُلے تھے کبھی اور نہ بام رکھتے تھے

وہ آ ہی جاتا کبھی ہم تو اُس کے رستے پر
چراغ جلتے ہوئے صبح و شام رکھتے تھے

○

میں کن لوگوں میں ہوں کیا لکھ رہا ہوں
سخن کرنے سے پہلے سوچتا ہوں

مرے نزدیک یہ کون آ رہا ہے
مَیں خود سے دُور ہوتا جا رہا ہوں

اداسی مشتہر ہونے لگی ہے!
بھرے گھر میں تماشا ہو گیا ہُوں

کبھی یہ خواب میرا راستہ تھے
مگر اب تو اذاں تک جاگتا ہوں

بس اِک حرفِ یقیں کی آرزو میں
میں کتنے لفظ لکھتا جا رہا ہوں

مَیں اپنی عُمر کی قیمت پہ تیرے
ہر اِک دُکھ کا ازالہ ہو رہا ہوں

میں تیرے ساتھ چلنے کی لگن میں
تھکن سے چُور ہوتا جا رہا ہوں

غضب کا خوف ہے تنہائیوں میں
اب اپنے آپ سے ڈرنے لگا ہوں

○

یہ عُمر بھر کا سفر اور یہ رائیگانی تری
کہاں گئی اے مرے دل یہ خوش گمانی تری

یہاں پہ کون اندھیروں میں ساتھ چلتا ہے
تُو اب بھی ساتھ ہے میرے یہ مہربانی تری

تجھے خبر نہیں ہم دیکھ کر بہت روئے
نئی کتاب میں تصویر اِک پُرانی تری

بھلائے بیٹھے ہیں اور اپنے حال میں خوش ہیں
تُو آ کے دیکھ کبھی ہم نے بات مانی تری

ابھی سے آبلے پڑنے لگے ہیں پاؤں میں
ابھی تو دور ہے منزل سفر کہانی تری

○

کیا بتائیں کیوں دیئے دمساز نے
زخمِ تنہائی مرے ہمراز نے

اُس کہانی کو ملے انجام کیا
جس کو رُسوا کر دیا آغاز نے

شہر کو کچھ اور عنواں دے دیئے
میری لغزش اور ترے انداز نے

کس یقیں اور کس تسلسل سے دیئے
دِل کو دھوکے اُس محبت باز نے

کتنا سندر کتنا کومل کر دیا
میرے گیتوں کو تری آواز نے

○

مجھے موت دے کہ حیات دے
مرے چارہ گر میرا سات دے

مری پیاس صدیوں کی پیاس ہے
مرے کربلا کو فرات دے

مرے رتجگوں کے حساب میں
کوئی ایک نیند کی رات دے

کوئی ایسا اسمِ عظیم ہو
جو تمہارے دُکھ سے نجات دے

یہ جو تیرگی ہے غرور میں
کوئی روشنی اسے مات دے

مری شاعری کے نصیب میں
کوئی ایک حرفِ ثبات دے

○

بہت تاریک صحرا ہو گیا ہے
ہوا کا شور گہرا ہو گیا ہے

کسی کے لمس کا یہ معجزہ ہے
بدن سارا سنہرا ہو گیا ہے

یہ شہرِ دل ہے جس کے چاروں جانب
تری یادوں کا پہرا ہو گیا ہے

وہ سنولایا ہوا چہرہ تو دیکھو
محبت میں سنہرا ہو گیا ہے

وہی ہے خال و خد کی خوشنمائی
یہ تِل آنکھوں کا گہرا ہو گیا ہے

○

بند ہوتی کتابوں میں اُڑتی ہوئی تتلیاں ڈال دیں
کس نے رسموں کی جلتی ہوئی آگ میں لڑکیاں ڈال دیں

خوف کیسا ہے یہ نام اُس کا کہیں زیرِ لب بھی نہیں
جس نے ہاتھوں میں تیرے ہرے کانچ کی چوڑیاں ڈال دیں

ہونٹ پیاسے رہے، حوصلے تھک گئے، عمر صحرا ہوئی
ہم نے پانی کے دھوکے میں پھر ریت پر کشتیاں ڈال دیں

موسمِ ہجر کی کیسی ساعت ہے یہ دل بھی حیران ہے
تیرے کانوں میں کس نے میری یاد کی بالیاں ڈال دیں

○

مکمل کچھ نظر آتا نہیں ہے
کبھی آنکھیں، کبھی چہرہ نہیں ہے

نہ کرنا وصل کی رُت پر بھروسہ
تمہیں اس دُکھ کا اندازہ نہیں ہے

ہوا کیوں سسکیاں لینے لگی ہے
ہمارا حوصلہ بکھرا نہیں ہے

کہیں گے دل سے تجھ کو بھول جائے
مگر کوشش ہے یہ وعدہ نہیں ہے

ہوائیں تھک کے سونا چاہتی ہیں
مگر کوئی دریچہ وا نہیں ہے

ہم ایسے راستے میں ہیں جہاں پر
کوئی جگنو، کوئی تارا نہیں ہے

○

ہر اک لمحہ نیا اک امتحاں ہے
بہت نامہرباں یہ آسماں ہے

دِلوں پر برف گرتی جا رہی ہے
بدن کا تجربہ بھی رائیگاں ہے

میں اُس سے بات کرنا چاہتا ہوں
بتاؤ تو سہی وہ اب کہاں ہے

مجھے کب اس کا اندازہ تھا، وہ بھی
مری جانب سے اتنا بدگماں ہے

محبت اِک ندامت بن گئی ہے
ہماری مختصر سی داستاں ہے

مسلسل خامشی یہ جانتی ہے
ہَوا سے گفتگو اب رائیگاں ہے

○

عشق کرو تو یہ بھی سوچو عرضِ سوال سے پہلے
ہجر کی پوری رات آتی ہے صبحِ وصال سے پہلے

دل کا کیا ہے، دِل نے کتنے منظر دیکھے لیکن
آنکھیں پاگل ہو جاتی ہیں ایک خیال سے پہلے

کِس نے ریت اُڑاتی شب میں آنکھیں کھول کے دیکھیں
کوئی ایک مثال تو دو ناں اُس کی مثال سے پہلے

کارِ محبّت ایک سفر ہے اس میں آجاتا ہے
ایک زوال آثار سا رستہ باب کمال سے پہلے

عشق میں ریشم جیسے دعدوں اور خوابوں کا رستہ
جتنا ممکن ہو طے کر لیں گردِ ملال سے پہلے

کشمیر

ضمیرِ عالمِ انسانیت خبر ہے تجھے
شرار و شعلہ کی زد میں ہے وادیٔ کشمیر

تجھے خبر ہے کہ جنّت نشان یہ وادی
لہو لہو ہوئی جاتی ہے دستِ قاتل سے
جہاں پہ روشنیٔ خوشبو بکھیرتی تھی کبھی
وہاں پہ خاک ہوئی جا رہی ہے آزادی

وہ پھول اُگاتی زمیں
اور گیت گاتی زمیں

وفا کے رنگ، محبت سے مسکراتی زمیں
کہ جس کے خواب بھی روشن
نگاہ بھی روشن
کہ جس کے راستے دل سے گزر کے جاتے ہیں
وہ دلفریب، دلآویز، دلربا منظر
گزرنے والوں کے دل میں اُترتے جاتے ہیں
ضمیرِ عالمِ انسانیت خبر ہے تجھے
وہ منظروں میں جو منظر تھے بھیتے جاتے تھے
وہ پھول سوکھتے اور گیت مرتے جاتے تھے
وہ رنگ اُڑتے وہ نغمے بکھرتے جاتے تھے
وہ سارے لوگ شبِ غم میں گھرتے جاتے ہیں

ضمیرِ عالمِ انسانیت خبر ہے تجھے
شرار و شعلہ کی زد میں ہے وادیٔ کشمیر

تجھے خبر ہے کہ جنت نشان یہ وادی
لہولہو ہوئی جاتی ہے دستِ قاتل سے
یہ دستِ قتلِ وفا جتنا بڑھتا جائے گا
ترے وقار کی گردن تلک بھی آئے گا
ضمیرِ عالمِ انسانیت سنبھال اسے
شرارِ شعلہ کی زد میں ہے وادیٔ کشمیر

○

سوچوں کی تیز دھوپ میں ٹھہرا دیا گیا
اپنی ہی خواہشوں میں یوں الجھا دیا گیا

ناراض کیوں ہے اتنا مرے اجتناب پر
یہ بھی تو دیکھ دُکھ مجھے کتنا دیا گیا

سیرابیٔ نظر یہ بھی تشنہ رہا بدن
اب کے تو برکھا رُت میں بھی ترسا دیا گیا

ہم خود ہی چھپ گئے ہیں لباسوں کی اوٹ میں
ورنہ تو جسم سب کو برہنہ دیا گیا

اے سنگِ ناسپاس مرا زخمِ دل تو دیکھ
مجھ کو مری وفا کا صلہ کیا دیا گیا

جب بھی سکوں کی راہ میں گرمِ سفر ملا
مجھ کو دکھوں کے موڑ پہ ٹھہرا دیا گیا

سوچو تو کوئی ہے کہ جسے شہر میں جمیلؔ
عرضِ ہُنر کا ایسا سلیقہ دیا گیا

○

بجھتی آنکھوں کا دھواں اور میں اکیلا آدمی
ایک دشتِ بے اماں اور میں اکیلا آدمی

کیسے بچ سکتا تھا میں اس کربلائے وقت میں
اِک ہجومِ دشمناں اور میں اکیلا آدمی

کب تلک سنتا رہوں اور یوں مسلسل چُپ رہوں
ایک فرضی داستاں اور میں اکیلا آدمی

کون دیکھے گا مری سچائیوں کے آئینے
سارے اُس پر مہرباں اور میں اکیلا آدمی

زخمِ تنہائی ہے کیا اب اس سے اُس کو کیا غرض
اُس کی سو ہمجولیاں اور میں اکیلا آدمی

آشیاں کے چار تنکوں کے تعاقب میں جمیلؔ
ہیں ہزاروں آندھیاں اور مَیں اکیلا آدمی

○

یہ دیکھ کر کہ وہ وعدہ خلاف آیا نہیں
اندھیری رات تھی ہم نے بھی دل جلایا نہیں

ہوا نے بھیجے بہت وفد آندھیوں کے مگر
چراغ حوصلۂ عشق، جھلملایا نہیں

ابھی کچھ اور برس دل پہ ہجر کے بادل
یہ شہر پوری طرح زیرِ آب آیا نہیں

اپنے دل کو ترا وعدہ نہیں ہونے دُوں گا
اس سمندر کو میں صحرا نہیں ہونے دُوں گا

دل تو دل ہے میں جلا لُوں گا یہ آنکھیں لیکن
ترے رستوں پہ اندھیرا نہیں ہونے دُوں گا

اپنے سائے کو سمجھ لُوں گا مَیں تیرا سایہ
خود کو اس شہر میں تنہا نہیں ہونے دُوں گا

اتنے ایثار و محبت پہ بھی اے شہرِ وفا
میں بُرا ہُوں تو بھرا اچھا نہیں ہونے دُوں گا

ترے کردار کی نیّت کا پتہ ہے لیکن
اس رفاقت کو تماشہ نہیں ہونے دُوں گا

بدگمانی کی ہَوا گرد اُڑائے ـــــ جتنی
دل کے آئینے کو مَیلا نہیں ہونے دُوں گا

ترکِ تعلقات بھی ہم کر نہیں سکے
مرنا تو چاہتے تھے مگر مر نہیں سکے

خواہش

کوئی نظم ایسی بھی لکھ سکیں
تری بات بات کی روشنی کبھی حرف حرف میں آ سکے
ترے لمس کی جو شگفتگی ہے وہ لفظ لفظ پہ چھا سکے
تری گفتگو سے بنائیں ہم
کوئی داستاں، کوئی کہکشاں
ہوں محبتوں کی نمازتیں بھی کمال طرح سے مہرباں
ترے بازوؤں کی بہار میں کبھی جھولتے ہوئے گائیں ہم
تری جستجو کے چراغ کو سرِ شام دل میں جلائیں ہم

اُسی جھلملاتی سی شام میں
لکھیں نظم جو ترا روپ ہو
کہ جو سخت جاڑوں کی خوشگوار سی دھوپ ہو
جو وفا کی تال پہ پور پور میں جاگتا ہوا رقص ہو
کوئی نظم جو ترا عکس ہو

عہد

ہم نے سوچ رکھا ہے
تم سے کچھ نہیں کہنا

چاہے دل کی ہر خواہش
زندگی کی آنکھوں سے اشک بن کے بہہ جائے
چاہے اب مکینوں پر گھر کی ساری دیواریں
چھت سمیت گر جائیں
اور بے مقدر ہم اس غبار و ملبے میں خود ہی کیوں نہ گھر جائیں
تم سے کچھ نہیں کہنا

کیسی نیند تھی اپنی، کیسے خواب تھے اپنے
صحنِ دل کے آنگن میں کیا گلاب تھے اپنے
اور اب گلابوں پر، نیند والی آنکھوں پر
نرم خُو سے خوابوں پر کیوں عذاب ٹوٹے ہیں
تم سے کچھ نہیں کہنا

بے لباس باتوں میں
گھر گئے ہیں راتوں میں
اس طرح کی راتوں میں
کب چراغ جلتے ہیں
کب عذاب ٹلتے ہیں
اب تو ان عذابوں سے کوئی بچ نکلنے کا راستہ نہیں ہے
جس طرح تمہیں سچ کے لازوال رستوں سے واسطہ نہیں ہے
تم سے کچھ نہیں کہنا

○

دشمنِ جاں کئی قبیلے ہوئے
پھر بھی خوشبو کے ہاتھ پیلے ہوئے

بدگمانی کے سرد موسم میں
میری گڑیا کے ہاتھ نیلے ہوئے

جب زمیں کی زباں چٹخنے لگی
تب کہیں بارشوں کے حیلے ہوئے

وقت نے خاک وہ اڑائی ہے
شہر آباد تھے جو ٹیلے ہوئے

جب پرندوں کی سانس رُکنے لگی
تب ہَواؤں کے کچھ وسیلے ہوئے

کوئی بارش تھی بدگمانی کی
سارے کاغذ ہی دل کے گیلے ہوئے

○

پلٹ کر پھر کبھی اُس نے پکارا ہی نہیں ہے
وہ جس کی یاد سے دِل کو کنارا ہی نہیں ہے

محبّت کھیل ایسا تو نہیں ہے لوٹ جائیں
کہ اس میں جیت بھی ہو گی خسارا ہی نہیں ہے

کبھی وہ جگنوؤں کو مٹھیوں میں قید کرنا
مگر اَب تو ہمیں یہ سب گوارا ہی نہیں ہے

اب اُس کے خال و خَد کا ذکر کیا کرتے کسی سے
جو ہم پر آج تک بھی آشکارا ہی نہیں ہے

یہ خواہش تھی کہ ہم کچھ دُور تک تو ساتھ چلتے
ستاروں کا مگر کوئی اشارا ہی نہیں ہے

بہت سے زخم کھا کر دِل نے آخر طے کیا ہے
تمہارے شہر میں اپنا گزارا ہی نہیں ہے

○

یہی نہیں کوئی طوفاں مری تلاش میں ہے
کہ موسمِ غمِ جاناں مری تلاش میں ہے

وصال رُت ہے مگر دل کو ایسا لگتا ہے
ستارۂ شبِ ہجراں مری تلاش میں ہے

میں فیصلے کی گھڑی سے گزر چکا ہوں مگر
کسی کا دیدۂ حیراں مری تلاش میں ہے

یہ بے یقین سی آسودگی بتاتی ہے
کہ ایک قریۂ ویراں مری تلاش میں ہے

میں تیرگی میں محبت کی اِک کہانی ہوں
کوئی چراغ سا عنواں مری تلاش میں ہے

یہ کیسا خواب تھا دھڑکا سا لگ گیا دل کو
کہ ایک شخص پریشاں مری تلاش میں ہے

○

کُل اثاثہ تھا اِک دیا لوگو
اور اب وہ بھی بجھ گیا لوگو

ہم نے چُپ چاپ ہار مانی تھی
تم نے تو شور کر دیا لوگو

ساتھ رہ کر بھی کتنا نادم تھا
کب تلک جھوٹ بولتا لوگو

وہ بھی خاموش تھا جُدائی پر
ہم نے بھی ضبط کر لیا لوگو

ہم نے اِک روز لوٹ آنا تھا
کوئی تو راہ دیکھتا لوگو

○

چراغ لے کر چلا تھا گھر سے ہَوا کے ہاتھوں میں آگیا ہُوں
مَیں کیسے موسم میں گھر گیا ہوں مَیں کس کی باتوں میں آگیا ہوں

بس ایک ساعت وصال کی تھی سو وہ گزر بھی چکی ہے لیکن
مَیں دِن کی خواہش میں جینے والا مہیب راتوں میں آگیا ہوں

انہیں خبر ہی نہیں کہ میری سخن سرا میں اُڑان کیا تھی
مَیں کتنے بے چہرہ اور اَن دیکھے رشتے ناتوں میں آگیا ہوں

اگرچہ پہلے بھی جیت میرے نصیب میں کب لکھی گئی تھی
بساط اُلٹی ہے اب تو ایسی کہ میں تو ماتوں میں آگیا ہوں

○

منفرد سا کوئی پیرایۂ فن چاہتی ہے
زندگی ایک نیا طرزِ سخن چاہتی ہے

روح کی بے سر و سامانی سے باہر آ کر
شاعری اپنے لیے ایک بدن چاہتی ہے

ہر طرف کتنے ہی پھولوں کی بہاریں ہیں یہاں
پر طبیعت وہی خوشبوئے وطن چاہتی ہے

دُور جا کر در و دیوار کی رونق سے کہیں
جیسا اندر ہے کوئی ویسا ہی بن چاہتی ہے

سانس لینے کو بس اِک تازہ ہوا کا جھونکا
کون کہتا ہے کہ وہ سرو سمن چاہتی ہے

○

اب اپنے فیصلے پر خود الجھنے کیوں لگا ہوں
ذرا سی بات پر اتنا بکھرنے کیوں لگا ہوں

وہ جس موسم کی اب تک منتظر آنکھیں تھیں میری
اُسی موسم سے اب میں اتنا ڈرنے کیوں لگا ہوں

مجھے نادیدہ رستوں پر سفر کا شوق بھی تھا
تھکن پاؤں سے لپٹی ہے تو مرنے کیوں لگا ہوں

مجھے یہ چار دیواری کی رونق مار دے گی
میں اک آثار تھا منزل کا مٹنے کیوں لگا ہوں

میں جس کو کم سے کم محسوس کرنا چاہتا تھا
اُسی کی بات کو اتنا سمجھنے کیوں لگا ہوں

جو میرے دِل کی گلیوں سے کبھی گزرا نہیں تھا
اب اپنے ہاتھ سے خط اس کو لکھنے کیوں لگا ہوں

بدن کی راکھ تک بھی راستوں میں نہ بچے گی
برستی بارشوں میں یوں سُلگنے کیوں لگا ہُوں

وہی سورج ہے دُکھ کا پھر یہ ایسا کیا ہوا ہے
میں پتھر تھا تو آخر اب پگھلنے کیوں لگا ہوں

○

ہجر کی شب ہیں قید کرے یا صبح وصال میں رکھے
اچھا مولا ! تیری مرضی تُو جس حال میں رکھے

کھیل یہ کیسا کھیل رہی ہے دِل سے تری محبّت
اِک پل کی سرشاری دے اور دنوں ملال میں رکھے

مَیں نے ساری خوشبوئیں دامن میں باندھ کے رکھیں
شاید ان کا ذکر تُو اپنے کسی سوال میں رکھے

ہَوا سے تیرے آنے کی سرگوشی کو سُنتے ہی
مَیں نے کتنے پھُول چُنے اور اپنی شال میں رکھے

مشکل بن کر ٹوٹ پڑی ہے دل پر یہ تنہائی
اب جانے یہ کب تک اس کو اپنے جال میں رکھے

○

اپنی نظروں سے جو گر جائے وہ چہرہ نہ بنا
مجھ کو اِک لمحۂ فرصت کا کھلونا نہ بنا

جھوٹا احساس کی قندیل بُجھا دیتا ہے
مجھ کو انسان سمجھ خود کو فرشتہ نہ بنا

سینکڑوں راستے ہیں اجنبی ہو جانے کے
ترک کرنا ہے تعلق تو بہانہ نہ بنا

مجھ کو منزل نہ سہی خواب تو منزل کے ملیں
اپنی منزل کے لیے مجھ کو تو رستہ نہ بنا

میں تو پہلے ہی بہت زخم لئے پھرتا ہوں
مجھ کو اب شہر میں اے عشق تماشہ نہ بنا

اپنی یادیں تو مرے دل میں کہیں رہنے دے
اس مہکتے ہوئے گلزار کو صحرا نہ بنا

جاگتی ہیں مرے احساس کی آنکھیں لیکن
نقش دیوار پہ اب کوئی پُرانا نہ بنا

کتبہ

جھوٹ سچ کے درمیان
فرق چاہتا تھا جو
چاہتوں کے پیڑوں کو
اپنے خون سے سدا
سینچتا رہا تھا جو
خود کو توڑ توڑ کر
دوستوں کے حوصلے
جوڑتا رہا تھا جو

مان شہد ہیں
موت کے یقین کو
ہاتھ جوڑ جوڑ کر
موڑتا رہا تھا جو

ا کہیں، کسے کہیں
دگی کی راہ سے
بے بسی کے زہر کی
قبہ میں اتر گیا،

○

دکھ کے عذاب سہہ لیے ہم نے تو ہجرتوں کے بعد
آئے گی رُت اب اور کیا غم زدہ موسموں کے بعد

پہلے فصیلِ جسم و جاں اتنی کہاں خراب تھی
اس میں شگاف پڑ گئے تیری جدائیوں کے بعد

رہنی ہے ساری عمر اب خالی سرائے دِل مری
آئے گا کون اب یہاں تجھ سے مسافروں کے بعد

لہجہ تھکا تھکا ترا ۔ پلکیں جھکی جھکی تری
اتنی خفیف سی خوشی کتنی صعوبتوں کے بعد

خوشبو، چراغ، شاعری، سارے ہی تیرے نام تھے
پھر بھی نہ یاد آیا تُو اتنی نشانیوں کے بعد

○

ترا ہی ذِکر ہے شہرِ ہُنر میں رکھا ہُوا
دگر نہ کیا ہے بھلا اپنے گھر میں رکھا ہُوا

تھکن اتار مگر مطمئن قبا نہ پہن
سفر اِک اور ہے رختِ سفر میں رکھا ہُوا

وہی ہتھیلیاں تجھ کو دُعائیں دیتی ہوئی
وہی چراغ سا دِل بام و دَر میں رکھا ہُوا

پتہ چلا اُسے تختِ سخن کو ٹھُکرا کر
نہیں ہے کچھ بھی نہیں، مال و زَر میں رکھا ہُوا

ترا مزاج نہیں اعتراف کرنے کا
تو پھر یہ کیا ہے تری چشم تر میں رکھا ہُوا

جو بے خبر ہے مرے شہر کی اُداسی سے
اُسی کو دیکھ لو اہلِ خبر میں رکھا ہُوا

بدل نہ دے کہیں مفہوم ہی عبادت کا
ترا پیام دلِ نامہ بر میں رکھا ہوا

جتنا تجھے چاہا تھا

کچھ بھی تو نہیں ویسا
جیسا تجھے سوچا تھا
جتنا تجھے چاہا تھا
کچھ بھی تو نہیں ویسا

سوچا تھا ترے لب پہ
کچھ حرف دعاؤں کے
کچھ پھول صداؤں کے
مہکیں گے مری خاطر
لگتا تھا جو دُکھ جھیلے
اس دل نے تری خاطر
بے شرطِ رفاقت ہیں
بے نام مسافت ہیں

بے انت محبت میں
جو عُمر گذاری تھی
اس ساری اذیت میں
اِک خواب سی خواہش میں
اِک زُعم سا تھا دل کو
تو میری محبت کے
چہرے کو تو پڑھ لے گا
آنکھوں کو تو چھو لے گا
دلدار سی صبحوں میں
ویران سی شاموں میں
ہم روز نکلتے تھے
جس شوق رفاقت میں
اس راہ کا، رستوں کا
اِقرار تو کرے گا
لیکن نہ ہُوا کچھ بھی
کتنا تجھے چاہا تھا
کچھ بھی تو نہیں ویسا!

احتیاط

ذرا کوشش کرو پھر سے
مجھے تم بھول جانے کی
تمہیں مشکل نہیں ہو گی
بڑی آسانیاں رکھی ہوئی ہیں
تم نے اپنے دل کے خانے میں
کسی خانے میں آنکھیں قید ہیں
اور قید آنکھوں میں
محبت، حسرتوں کے ساتھ مل کر رو رہی ہے
کسی خانے میں دل ہے، اور یہ دل اب دھڑکنا بھول بیٹھا ہے
کسی خانے میں چہرہ ہے
اور اس چہرے کے ہونٹوں پر

اُمیدیں سر جھکائے نادم و شرمندہ حالت ہیں
کسی مجبور ساعت میں
کسی سرسبز و خوشبو دار اور تازہ ہوا کے موسموں کی منتظر ہیں
کسی خانے میں نازک انگلیاں ہیں
خوبصورت دست و بازو ہیں
نہ اب یہ خوبصورت ہیں، نہ اب اِن
انگلیوں میں نازکی ہے
لہو تک بہہ چکا ہے ان کی پوروں سے
یہ سب لمحہ بہ لمحہ
ایک اِک بے رحم ساعت کی نشانی ہے
تمہاری خود پسندانہ روایت کی کہانی ہے
مجھے بھی تم کسی خانے میں رکھنے سے کہیں پہلے
ذرا کوشش کرو پھر سے، مجھے تم بھول جانے کی
تمہیں مشکل نہیں ہوگی۔

احساس

جُرم جس کسی کا ہو
بعض بدگماں لمحے
میری خواہشوں کے پاؤں
اس طرح جکڑتے ہیں
روح چیخ اُٹھتی ہے
ذہن ٹوٹ جاتا ہے
دل رفاقتوں میں بھی
اجنبی دیاروں کی
ریت اپنی آنکھوں میں

یوں سمیٹ لیتا ہے
جیسے جُرم میرا ہو
دوستی نبھانے کا
بارِ غم اُٹھانے کا
سارا جُرم میرا ہو
مَیں جو ایک شاعر ہوں
بعض بدگماں لمحے
میری خواہشوں کے پاؤں
اس طرح جکڑتے ہیں
رُوح چیخ اُٹھتی ہے
ذہن ٹوٹ جاتا ہے !

مشورہ

چلو یہ طے ہوا
ہم تم
جُدا ہونے سے پہلے
از سرِ نو جائزہ لیں گے
یہ دیکھیں گے
محبّت کس نے کم کی تھی
وفا کس نے زیادہ کی
محبّت پھر کریں گے
اس سے پہلے جائزہ لے لیں

یہی دِن تو میرا غرور ہے

وہ جو تجھ سے پہلے طلوع تھے
وہ جو تجھ سے پہلے شروع تھے
نہ وہ دن تھے میری حیات کے
نہ وہ خواب تھے مِری ذات کے
نہ وہ صبح ، صبحِ جمال تھی
نہ وہ شام ، شامِ وصال تھی
مِرے چاروں سمت بچھا ہُوا
کوئی خوف تھا ، کوئی جبر تھا
کسی ناروا سے سلوک کا .... دلِ ناتواں پہ تنا ہوا
کسی خاکِ ہجر کا ابر تھا

ہیں پیاس تھی — لبِ مہرباں پہ جمی ہوئی
ہیں دوپہر رہِ ماندگاں پہ تنی ہوئی
ہیں آس و یاس کے مرحلے ... کہیں خواب کے یونہی ٹوٹ جانے کے سلسلے
ڑے خلفشار کی رات تھی
گر اے حکایتِ خونچکاں
وہ چراغ جلنے کی رات تھی
گر اے وفا کے سفیرِ دن
یہ ترے ظہور کی بات ہے
یہ ترِے طلوع کی نظم ہے
یہ ترِے وصال کی رات ہے
ہی دن تو میرا غرور ہے
ہی روشنی کی کتاب ہے
ہی دن تو میرا سوال تھا
ہی دن تو اس کا جواب ہے !

○

لہو بھی آنکھ سے اب بہہ لیا ہے
بہت تھا جبر لیکن سہہ لیا ہے

عذابِ ہجر اب واپس پلٹ جا
بہت دن ساتھ میرے رہ لیا ہے

نمی آنکھوں سے جاتی ہی نہیں ہے
یہ کیسا زخم دل نے سہہ لیا ہے

بدن کوئی ٹھکانا چاہتا ہے
بہت دن راستوں میں رہ لیا ہے

تجھے کہنا تھا جو احوال دل کا
وہ اپنے آپ سے ہی کہہ لیا ہے

○

تمہیں خبر ہی نہیں کیسے سر بچایا ہے
عذاب جاں پہ سہا ہے تو گھر بچایا ہے

لہو میں آگ لگاتی ہوئی فضا میں بھی
یہ معجزہ ہے کہ دستِ ہنر بچایا ہے

تمام عمر تعلق سے منحرف بھی رہے
تمام عمر اسی کو مگر بچایا ہے

ہر اعتراض پہ گہری طویل خاموشی
یہی تو وصف مرے ہمسفر بچایا ہے

اُسی نے صبح مرے گھر کو راکھ کر ڈالا
وہ اِک چراغ جسے رات بھر بچایا ہے

یہ اعتبارِ مسیحائی میرے چارہ گرو
بہت کٹھن تھا بچانا مگر بچایا ہے

عجیب صورتِ حالات ہو گئی اپنی
جنوں کو ترک کیا اور ڈر بچایا ہے

آثار

سنو!
جب خوشبوئیں اعلان کرتی ہوں
کسی کے لوٹ آنے کا
تو پھر لفظوں میں کیسے لکھ سکیں گے
اُس کی آمد کی کہانی کو
وفا کی حکمرانی کو
سنو — تم بھی ذرا دیکھو
محبت کی دعائیں مانگتی شب نے
نئے اِک سرخرو دن کے یہیں آثار دیکھے ہیں
یہ کیسا خوشگوار احساس ہے
آئندہ برسوں میں

ہر اک موسم، ہر اک دن کی دھنک کرنوں کو
ہم اک ساتھ برتیں گے

سنو! یہ خوشبوئیں اعلان کرتی ہیں
کسی کے لوٹ آنے کا

○

عمر رائیگاں کر دی تب یہ بات مانی ہے
موت اور محبت کی ایک ہی کہانی ہے

کھیل جو بھی تھا جاناں اب حساب کیا کرنا
جیت جس کسی کی ہو ہم نے ہار مانی ہے

وصل پر بھی نادم تھے، ہجر پر بھی نادم ہیں
وہ بھی رائیگانی تھی یہ بھی رائیگانی ہے

ہے مرا ہنر تیری خوشبوؤں سے وابستہ
میرے سارے لفظوں پر تیری حکمرانی ہے

جانے کون شہزادہ سب چرانے آجائے
وہ جو اپنے آنگن میں خوشبوؤں کی رانی ہے

زخم ہی تو آئے ہیں ان پہ اتنی حیرت کیوں
چوڑیاں بکھرنے کی رسم یہ پرانی ہے !

○

اب یہ بات مانی ہے
وصل رائیگانی ہے

اُس کی سرد آنکھوں میں
ہجر کی کہانی ہے

جیت جس کسی کی ہو
ہم نے ہار مانی ہے

چُوڑیاں بکھرنے کی
رسم تو پُرانی ہے

عمر کے جزیرے پر
غم کی حکمرانی ہے

تُو ملے تو وحشت کی
داستاں سُنانی ہے

ہجرتوں کے صحرا کی
دل نے خاک چھانی ہے

○

آنکھیں جو دیکھتی تھیں وہ منظر بھی چھن گیا
لے دے کے ایک گھر تھا سو وہ گھر بھی چھن گیا

ہم اشکبار لوگ تھے، تنہا نہ تھے کبھی
اب تو وہ آنسوؤں کا سمندر بھی چھن گیا

چھینے تھے پہلے خواب مسلسل فریب نے
اب تو دُلہن سے صبر کا زیور بھی چھن گیا

تُو تھا تو شہرتیں تھیں، محبت تھی چار سُو
پھر تیرے بعد جیسے مقدر بھی چھن گیا

سچ بولنے کے جُرم میں جھوٹے مقام پر
دستار چھن گئی تو لگا سر بھی چھن گیا

○

ہجر سہنے کی غم شناسی کی
آخری شام ہے اُداسی کی

تیری باتوں کو معتبر جانا
ہم نے لغزش یہیں ذرا سی کی

یوں ہَوائیں تھکی تھکی کب تھیں
کیفیت آج ہے اُداسی کی

میری تاریخ کے بدن تجھ کو
اب ضرورت ہے بے لباسی کی

○

پوچھ لو پھول سے کیا کرتی ہے
کبھی خوشبو بھی دفا کرتی ہے

خیمۂ دِل کے مقدّر کا یہاں
فیصلہ تیز ہَوا کرتی ہے

بے رخی تیری، عنایت تیری
زخم دیتی ہے، دَوا کرتی ہے

تیری آہٹ مری تنہائی کا
راستہ روک لیا کرتی ہے

روشنی تیرا حوالہ ٹھہرے
میری ہر سانس دُعا کرتی ہے

میری تنہائی سے خاموشی تری
شعر کہتی ہے، سُنا کرتی ہے

○

ہمارے بس میں اگر اپنے فیصلے ہوتے
تو ہم کبھی کے گھروں کو پلٹ گئے ہوتے

یوں ساتھ رہ کے سلگنے سے کتنا بہتر تھا
کسی مقام پہ ہم تم بچھڑ گئے ہوتے

کبھی تو ریت کو ہم مٹھیوں میں بھر لیتے
کبھی ہواؤں سے اپنے مکالمے ہوتے

ہمارے نام پہ کوئی چراغ تو جلتا
کسی زباں پہ ہمارے بھی تذکرے ہوتے

ہم اپنا کوئی الگ راستہ بنا لیتے
ہمارے دل نے اگر حوصلے کیے ہوتے

وہ جو شامِ شہرِ وصال میں

صفِ دُشمناں کو نوید ہو
کسی گہری چال کے اہتمام کا سلسلہ ہی فضول ہے
کہ شکست یوں بھی قبول ہے

صفِ دشمناں کو نوید ہو
کبھی اُن کے غیظ و غضب کے سامنے
حوصلے جو مثال تھے، وہ نہیں رہے
کبھی لفظ لفظ کے جسم پہ
جو معانی کے پر و بال تھے، وہ نہیں رہے
مری شاعری کے جہان کو

کبھی تتلیوں، کبھی جگنوؤں سے سجائے پھرتے خیال تھے
وہ نہیں رہے

وہ جو شامِ شہرِ وصال میں
کوئی روشنی سی لیے ہوئے کسی لب پہ جتنے سوال تھے
وہ سپردگی سی لیے ہوئے
مری پور پور میں جاگتے جو جواب تھے
جو وفا کے باب میں وحشتوں کے کمال تھے
وہ نہیں رہے

صفِ دُشمناں کو نوید ہو
وہ جو سرخروئی کے نشے میں
کبھی ہم جو اتنے نہال تھے وہ نہیں رہے
وہ کبھی جو عہدِ نشاط میں
کسی ایک ہلکے سے زخم پر بھی جو اندمال کے ہاتھ تھے

وہی زندگی کا ثبات تھے
وہ نہیں رہے

یہاں اب تو دل کی زبان پر
فقط ایک قصّۂ حال ہے
جو ملال ہے
صفِ دُشمناں کو نوید ہو

یقین

چانک ان دنوں کیسی یہ الجھن جاگ اٹھی ہے
نجانے آگہی اور خواب کے مابین کیسا مسئلہ ہے
ہ ہر تخلیق سے پہلے
جب سا خوف دل کو گھیر لیتا ہے
لماں یہ ہونے لگتا ہے
یں اپنی آخری تحریر لکھنے جا رہا ہوں

سخن کی شب کے ہاتھوں میں
وہ میرے نام کے جتنے ستارے تھے
وفا کے استعارے تھے

سب اپنی عمر پوری کر چکے تھے
یہی اک آخری تارا چمکتا ہے

عجب دھڑکا سا رہتا ہے
کہ جتنے شعر لکھے ہیں
جنہیں میں اپنے ہونے کی گواہی کی طرح محسوس کرتا ہوں
یہ پھر لکھے نہ جائیں گے
مری نظمیں
جو اَب تک آرزوؤں کا سنہرا عکس بن کر جھلملاتی ہیں
محبت کی زمینوں پر اُترتے
ہجر کے اور وصل کے سب موسموں کی بات کرتی ہیں
ہمیشہ کے لیے ہی روٹھ جائیں گی

گماں یہ بے ثباتی کا
یقیں بن کے ہر لمحہ

ی شدت سے میرے ذہن کا دامن ہلاتا ہے
سے باور کراتا ہے
حرف و لفظ کا جتنا اثاثہ تھا
ما کی سرحدوں پر ہے
فن سچائی کا سارا تفاخر ٹوٹنے کو ہے

یب بے نام الجھن ہے
ہر تخلیق سے پہلے یہی محسوس ہوتا ہے
ں اپنی آخری تحریر لکھنے جا رہا ہوں

تُم کو بھی ڈس نہ لیں یہ جُدائی کی ناگنیں
رکھنا محبّتوں میں قدم دیکھ بھال کر

واہمہ

یُمان موسم کا
بے یقین چہروں کا
نگ جس طرح کا ہو معتبر نہیں ہوتا
بے معانی باتوں کا
بے چراغ راتوں کا
وئی رُخ نہیں ہوتا
بس طرح محبّت میں
بزنگاہ لوگوں کے
اٹ دار لہجے کی
تند و تیز بارش سے
ل کو بھیگ جانے کا

کوئی غم نہیں ہوتا
جس طرح جُدائی کی
شب میں وصل لمحوں کا
بے اُمید خوابوں کا
خواب خواب آنکھوں کی
بے ستارہ راتوں کا
کوئی دن نہیں ہوتا
میں بھی اِک مسافر ہوں
جس کے پاؤں کے نیچے
راستہ نہیں کوئی
میں بھی ایک شاعر ہوں
جس کے لفظ میں جاناں
اب کسی محبت کا
سلسلہ نہیں کوئی!

تمہیں تو پہلے کہا تھا مَیں نے

ں تو پہلے کہا تھا میں نے
ولِ خواہش کے جس سفر پر نکل پڑے ہو
بھی سوچ کر لوٹ کر پھر نہ آسکو گے
رِ ناکامئ طلب سے
ٹ بھی آؤ جو اس سفر سے
تم کہاں تک سوال کرتی ہوئی نگاہوں سے بچ سکو گے
زرد چہرہ چھپا سکو گے
زخم دل ہی دکھا سکو گے
ئرمرے سارے تجربوں کو
سردہ آنکھوں کی وحشتوں کو

شکستہ دل کی اداسیوں کو
تمہارے شوقِ سفر نے راہوں کی دھول جانا، ببول جانا
تمہاری آنکھیں حصولِ خواہش کے راستوں سے چمک گئی تھیں
تمہارے کانوں میں قربِ منزل کے کتنے نغمے مچل رہے تھے
تمہاری باہیں تمہارے رستوں میں شمعِ قندیل جل رہی تھیں
تمہارے دل میں وصالِ بُت کے حسین غنچے کھلے ہوئے تھے
مگر یہ کیا کہ پلک جھپکتے ہی آ گئے ہو
طلب کی سنگین وادیوں سے
سجائے پیشانیٔ وفا پر
دریدہ دل اور سلگتی آنکھیں
مجھی سے دریافت کر رہے ہو
علاجِ ناکامیٔ تمنّا
تمہیں تو پہلے کہا تھا میں نے!

○

کہاں لگی منزلیں اب تو سراب چاہتا ہے
یہ دل تجھے نہیں بس تیرے خواب چاہتا ہے

یہ اور بات کہ اُس کا کہیں شمار نہ کر
مگر وہ شخص تجھے بے حساب چاہتا ہے

تباہ کر تو لیا قصرِ حلقۂ یاراں
اب اور کیا دلِ خانہ خراب چاہتا ہے

ہمیں تو پاسِ رفاقت نے ضبط میں رکھا
وگرنہ کون مسلسل عذاب چاہتا ہے

ہیں خار خار مرے موسموں کی تصویریں!
خزاں رتوں میں بھی وہ تو گلاب چاہتا ہے

یہ دل بہلتا نہیں اور اس اندھیرے میں
چراغِ جاں کہ مکمل کتاب چاہتا ہے

بگڑ گئے ہیں تو اب خال و خد چھپانے کو
یہ شہر اپنے لئے اِک نقاب چاہتا ہے

○

یہ اب تُو کس لئے دل گیر ہوتا جا رہا ہے
بچھڑنا تو مری تقدیر ہوتا جا رہا ہے

ہم اپنی خواہشوں اور رابطوں میں وہ نہیں ہیں
جو سارے شہر میں تشہیر ہوتا جا رہا ہے

میں جس کے زہر سے اُس کو بچانا چاہتا ہوں
اُسی موسم سے وہ تسخیر ہوتا جا رہا ہے

زمیں والے توقع اور کچھ رکھے ہوئے تھے
مگر مجھ سے یہ کیا تحریر ہوتا جا رہا ہے

ذرا محتاط ہو کر شاعرانہ گفتگو کر!
ترا لہجہ مری تصویر ہوتا جا رہا ہے

ایک شعر

تُم جا رہے تھے چھوڑ کے میری وفا کا ہاتھ
میں ساری رات خواب میں تجھ سے خفا رہا

○

شعر کہنا ہے مگر اُس میں گِلہ لکھنا نہیں
اور یہ بھی طے ہے تجھ کو بے وفا لکھنا نہیں

اس بھنور سے پہلے جو جو ساتھ تھا لکھنا ضرور
لیکن اس کے بعد کا منظر ہُوا لکھنا نہیں

یہ تو لکھنا کس کی آنکھوں نے دکھایا تھا ہمیں
پھر کہاں تک لے گیا وہ راستہ لکھنا نہیں

خط بھی لکھیں گے بہر انداز چاہت سے تجھے
لیکن اس میں ایک حرفِ مُدعا لکھنا نہیں

خواب تو دیکھے تھے آنکھوں نے تمہارے نام کے
اور پھر اس نام نے جو کچھ دیا لکھنا نہیں

بس بہت ہو چکا

بس بہت ہو چکا جبر دل پر مرے
صبر کی سب حدیں، ضبط کے سلسلے
اور دلِ ناتواں کے سبھی حوصلے
ذہن کی سب رگیں، خواہشیں، ولولے
ٹوٹ کر جا گرے
مری بینائی کی سرحدوں سے پرے
بَن گئی درد کی
قبر دل پر مرے
بس بہت ہو چکا جبر دل پر مرے

روشنی کی طلب ماند پڑنے لگی
ہاتھ خالی ہوئے، عمر صحرا ہوئی
اور ہوا بھی بہت تیز چلنے لگی
ایسی تنہائی کی "ہُو" کتی رات میں
لمحہ لمحہ بکھرتی ہوئی ذات میں
دشتِ حالات میں
کیسے آئے کوئی
بے یقینی کے ککھے ہوئے، ہات پر
غم کی ریکھاؤں کے حرف دیکھے کوئی
چھا گیا ہجر کا ابر دل پر مرے
بس بہت ہو چکا جبر دل پر مرے
اب کسی شام کا
اب کسی نام کا
منتظر دل نہیں
کون سی آنکھ ہے
جس کی دہلیز پر

برف کی سِل نہیں
خود سے لڑنے کا بھی حوصلہ اب نہیں
اور اس جنگ کا بھی صلہ اب نہیں
جم گیا ہے کوئی صبر دل پر مرے
بس بہت ہو چکا جبر دل پر مرے !

○

شام کی طرح اندھیروں میں اُتر جاؤں گا
تجھ سے بچ کر اے غمِ یار کِدھر جاؤں گا

زندگی مجھ کو حوادث سے ڈراتی کیوں ہے
جتنا دُکھ دے گی مجھے اتنا نکھر جاؤں گا

پائے امروز تھکن سے مرا بوجھل ہے تو کیا
زخمِ اندیشۂ آئندہ تو بھر جاؤں گا

راس آئی ہے کچھ ایسی مجھے ماحول کی چُپ
اَب جو آواز کوئی دے گا تو ڈر جاؤں گا

اس طرح بند نہ کر مجھ پہ دَر دیدہ و دل
مَیں تو دھڑکن ہُوں تیرے دل میں اُتر جاؤں گا

یہ الگ بات جلے، صُبح تلک میرا لہُو!
شبِ تاریک تجھے، قتل تو کر جاؤں گا

○

گِلہ کرے بھی اگر دل تو کیا کرے اُس سے
کہ پہلے جیسے مراسم نہیں رہے اُس سے

مجھے خیال تھا اُس کا اُسے زمانے کا
خدا کرے کہ زمانہ وفا کرے اُس سے

بہت غرور، بڑے زعم میں وہ لوٹا ہے
غریب شہر بھلا جا کے کیا کہے اُس سے

ہمیں خبر ہی نہ تھی وہ بچھڑنے والا ہے
وگرنہ سوچتے، مہلت ہی مانگتے اُس سے

میں زخم زخم اگر ہوں تو یہ تو ہونا تھا
لگاؤ تھا بھی بہت دوستو مجھے اُس سے

یہ کس طرح سے ہوا، اس طرح نہیں ہوتا
اَنا کی بات تھی اب کیسے پوچھتے اُس سے

○

رکھ دیں نہ ترے خواب جزیروں کو جلا کر
ہر روز نہ اُن سانولی آنکھوں سے مِلا کر

اب تُو بھی گریزاں ہے رفاقت سے ہماری
پچھتائے بہت ہم بھی تجھے، سامنے لا کر

ملتا تو ہوں مَیں روز، مگر بے ہنروں سے
رکھتا ہوں بہت قامت و قد اپنا بچا کر

تُجھ کو بھی مری طرح نہ تنہائی چُرا لے
اس شہر کی سڑکوں پہ مرے ساتھ چلا کر

افلاک نژادوں سے کہاں دوستی اپنی
ہم خاک نشینوں سے ذرا کم ہی مِلا کر

اس دل کے مقدّر میں کہاں روشنی پھر بھی
رکھ دیتا ہوں اُمید کی شمعوں کو جلا کر

شام آواز کا استعارہ نہیں

م صحرا نہیں
م دریا نہیں
ام منزل نہیں
ام رستہ نہیں
ام تو شام ہے
ب کی دہلیز پہ
ہم ہجر کا
ب الزام ہے
ام تو شام ہے
ام چہرہ نہیں، جس کی آنکھوں سے ہم تیری آنکھوں تیرے دل سے باتیں کریں
ام وعدہ نہیں، جس کی بنیاد پر زندگی کا سفر بے ارادہ کریں
ام تو شام ہے
ام آواز کا استعارہ نہیں

جو بھٹکتے مسافر کو تاریک رستوں سے پہلے صدا دے
اُسے روک لے
شام خوشبو نہیں
جو ہواؤں میں رنگ صبا گھول دے
کشتیاں حبس موسم میں گھر جائیں تو بادباں کھول دے
شام تو شام ہے
ایک پل کی طرح
بے نشاں بے نشاں
شام تو بھی نہیں
ہے مری آرزو
رائیگاں، رائیگاں
شام تو شام ہے
شب کی دہلیز پر
موسمِ ہجر کا
ایک الزام ہے
شام تو شام ہے

"برتھ ڈے"

س برس بھی
ام کی دہلیز پہ
وم بتّی کی جگہ آنکھ جلیں
ں برس بھی کیا قیامت خیز تنہائی تھی
ں کی میز پر
رتھ ڈے کا کیک رکھتے ہی
ئی برباد اُمیدیں — کئی بے آس یادیں
ر جھکائے
تھ میں کچھ موتیے کے پھول، کچھ تھنے گلابوں کے لئے

صف بہ صف - دیوار جاں سے آ لگیں
کتنی باتیں آج کے دن کے حوالے سے
مرے چاروں طرف
اپنے معنی کی غلط ترسیل پر
روتی رہیں
کتنے شرمندہ سے وعدے
میرے سینے میں چھپے زخموں کو اپنے
آنسوؤں کے عطر سے ۔۔ دھوتے رہے، روتے رہے
اور میں اس کمرۂ دل میں
تمھارے برتھ ڈے کے کیک کے سینے سے لگ کر
تم سے "ہیپی برتھ ڈے"
کہتا رہا
اپنی غربت کی قسم، تم کو دُعا دیتا رہا
اور تم جانے کہاں
کس دیس میں
اپنی وفا کی سلطنت کے شاہزادے کو لئے
اِک لباس خوشبوئے زرتاب، زیب تن کئے
دوستوں اور قیمتی تحفوں کے جھرمٹ میں
ہزاروں خواہشوں اور سینکڑوں خوابوں کی تعبیروں
کی محفل میں
جب اپنی برتھ ڈے کا کیک ۔۔۔ کاٹو تب
تمہیں ماضی کی کوئی شام
کوئی دوپہر بھی یاد، ہو
ناں یاد ہو
اور تمہیں اِک چہرۂ بے خال و خد بھی یاد ہو ناں یاد ہو
لیکن
سُنو اے بے وفا میرے
مجھے کچھ بھی نہیں بھُولا !
مجھے کچھ بھی نہیں بھُولا !

دلیلیں تک کریں گی

تم اپنی گفتگو میں کچھ دنوں سے یہ تاثر دے رہے ہو
کہ ہم نے مشترک احساس کی آنکھوں سے جتنے خواب دیکھے تھے
وہ منزل تک پہنچنے کا بہانہ تھے
تقاضہ تھے سفر میں ساتھ رہنے کا
تم اپنی گفتگو میں کچھ دنوں سے یہ تاثر دے رہے ہو
کہ منزل کی لگن میں
جو مسافر ساتھ ہوتے ہیں
وہ سب دل میں نہیں رہتے
کچھ آنکھوں کی فصیلوں تک
کچھ احساسات کو چھُو کر گزرتے ہیں
مگر دل میں نہیں بستے

بسا اوقات رستوں پر ضرورت بھی رفاقت کے لیے مجبور کرتی ہے
سو مجبوری الگ شے ہے
محبّت اور جذبہ ہے
تم اپنی گفتگو میں کچھ دنوں سے یہ دلیلیں دے رہے ہو،
کہ اب
اُس سے زیادہ دوستی کے راستوں پر ساتھ رہنا
گرد ہونے کی علامت ہے
تمہاری عمر اِک بجھتا دیا ہے
ابھی آنکھوں میں دُنیا کا ہر اِک منظر سلامت ہے
مری منزل محبّت ہے
محبّت تم نہیں ہو
مری تنہائیوں کی رہگذر پر تُم شجر تھے
جس کے سائے میں
مجھے کچھ دیر رُکنا تھا
سنبھلنا تھا
جہاں مجھ کو سنبھلنا تھا
وہیں پر موڑ آنا تھا

سو اب اس موڑ سے آگے مری منزل
محبّت کی توانائی سے مجھ کو کھینچتی ہے
اور تمہیں اس موڑ سے
اُس سمت جانا ہے
جہاں ہر گام پر سو موڑ ہیں ـــــ ہر موڑ اِک دُکھ ہے
مگر مَیں سوچتا ہوں
تم مجھے خود سے جُدا کرنے کی
ایسی بے آواز و بے سبب
کتنی دلیلیں دے چکے ہو
دے رہے ہو
تم اپنی ان دلیلوں میں توازن رکھ سکو گے
یا ـــــ دلیلیں شک کریں گی !

○

کب سے چادر اوڑھ کے بیٹھی ہے غم کی
ضدی لڑکی بات نہ مانے موسم کی

تیرے خواب کی روشنیوں نے آگھیرا
جب بھی جاگتی آنکھوں کی لَو مدھم کی

پہلے ملنا ، مِل کے بچھڑنا ـــــ پھر رونا
یہ لغزش بھی ہم دونوں نے باہم کی

آنکھیں جیسے جگنو گہری راتوں میں
ہونٹ کے جن پر بوندیں ٹھہریں شبنم کی

اُس کے ہونٹ بھی میرے نام سے منکر تھے
مَیں نے بھی اس بار محبت کچھ کم کی

اب آئے ہو جب یہ دل ناسُور ہُوا
نہیں ضرورت اِن زخموں کو مرہم کی

گمان

محبّت کا سفر آسان لگتا تھا
دلِ برباد
تجھ کو یہ سفر آسان لگتا تھا
اِدھر تو سوچتا تھا
اور
اُدھر آنکھوں سے
کوئی خواب چہرہ آن لگتا تھا
مگر
خوابوں میں رہنا

خواب جیسی بے حقیقت
خوشبوئے صحرا میں رہنا ہے
کناروں
سے جو ہو محروم
اُس دریا میں رہنا ہے
دلِ برباد
ہم نے تو کہا تھا
یہ سفر آسان لگتا ہے
مگر
آنکھیں بدن سے
چھین لیتا ہے !

○

دل جو دریا تھا آج صحرا ہے
کس قدر بے چراغ رستہ ہے

مَیں اکیلا نہیں کہ تھک جاؤں
مجھ میں اِک دوسرا بھی رہتا ہے

خود پہ ہونے لگا گمان تیرا
کِس قدر مَیں نے تجھ کو سوچا ہے

تیری خواہش تھی، اُس کو جانا تھا
کِس لئے اب ملال کرتا ہے

ذہن تو رہن رکھ دیئے سب نے
اب یہاں کون سوچ سکتا ہے

ہم تو جا چکے جاناں

اب یہ کیسی اُلجھن ہے
اب یہ کیسا جھگڑا ہے
بات تھی محبت کی
اور تم محبت پر
ایک ہی محبت پر
کب یقین رکھتے تھے
تم تو ہر گھڑی اپنی
دلبرانہ آنکھوں میں
اِک نئی رفاقت کا خواب لے کے اُٹھتے تھے

اور اپنی شاموں میں
اپنے خواب و خواہش کے
بے لباس جذبوں کو
شوق سے سجاتے تھے
اور ایسے عالم میں
جسم و جاں کے موسم میں
ایک ہم ہی اُلجھن تھے
ہم تو جا چکے جاناں
دل پہ بے وفائی کے
زخم کھا چکے جاناں
اب یہ کیسی اُلجھن ہے؟
اب یہ کیسا جھگڑا ہے؟

پتھر نہ بن وہ قرب کے رشتے بحال کر
اے دشمنِ خلوص و وفا کچھ خیال کر

اب تو قبول کر لے نئی روشنی کے شہر
لایا ہوں خود کو تیرے ہی سانچے میں ڈھال کر

ایسا نہ ہو کہ حبس کا موسم ٹھہر ہی جائے
اے ربِّ زندگی مری سانسیں بحال کر

یونہی نہیں ملے تری چاہت کے یہ گہر
میں نے بھی رکھ دیئے تھے سمندر کھنگال کر

مانا کہ جل بجھا ہوں سیہ غم کی رات میں
لیکن یہ دیکھ کتنے گھروں کو اجال کر

کوئی بھی وقت ایک سا رہتا نہیں جمیلؔ
بیتی ہوئی رُتوں کا نہ اتنا ملال کر

○

کتنی دُور تلک وہ تنہا جا سکتا ہے
جانے والا لوٹ کے بھی تو آ سکتا ہے

ناممکن ہے، لیکن کوشش تو کر دیکھیں
آندھی میں اِک دیا جلایا جا سکتا ہے

اِک مجبوری اور کچھ دُوری بھی حائل ہے
ورنہ اُس کا پتہ چلایا جا سکتا ہے

یہ دُنیا ہے اور وہ دنیا دار نہیں ہے
جائے جتنی دُور تلک وہ جا سکتا ہے

تم نے ایسا زہر بھرا ہے دوستیوں میں
اب اس زہر سے شہر اُجاڑا جا سکتا ہے

○

عہدِ وفائے طرزِ محبت بدل نہ جائے
پھر سوچ لے کہ بابِ رفاقت بدل نہ جائے

ہم چاہتے ہیں تجھ سے نباہیں تمام عُمر
ڈرتا ہے دل کہیں تری نیّت بدل نہ جائے

اظہارِ مُدعا میں نہ اب اتنی دیر کر
اُس بے وفا کی چشمِ عنایت بدل نہ جائے

تم دیکھنا کہ اپنی محبت کے سامنے
اس شہرِ سنگ دل کی روایت بدل نہ جائے

اِک خوف سا ہے چھوڑ کر اپنی زمین کو
مجھ سے مِرا وطن، مِری جنت بدل نہ جائے

جلتے رہیں گے سارے مکیں غم کی دھوپ میں
جب تک مکانِ ہجر تری چھت بدل نہ جائے

○

میں بہت بھٹکا بالآخر شام کو گھر آ گیا
میرے اندر سے نکل کر خوف باہر آ گیا

اُس میں جتنی روشنی ہے اس میں کچھ میری بھی ہے
لیکن اُس کا سب اندھیرا میرے رُخ پر آ گیا

ایک آنسو جانے کیسی ساعتِ بیتاب میں
میرے دل میں اُسکی آنکھوں سے اُتر کر آ گیا

میں اکیلے پن کے صحرا سے بہت مانوس تھا
یہ کہاں سے تیری یادوں کا سمندر آ گیا

ایک لاحاصل مسافت کی تھکن پاؤں میں ہے
ایک نادیدہ سفر کا خوف سر پر آ گیا

میں نے تو مانوس دستک پر ہی در کھولا مگر
ایک سناٹا سا میرے گھر کے اندر آ گیا

اب تو اِک خوفِ زمانہ کے سبب یکجا ہیں ہم
ورنہ آنکھوں سے دلوں کا زہر باہر آ گیا

جانے کیسا شخص تھا جس کے بچھڑتے ہی جمیلؔ
ایک سایہ سا مرے قد کے برابر آ گیا

ایک شعر

اُس کو بنا کے آسماں، خود کو زمین کر لیا
مجھ سے تو اُس نے جو کہا، میں نے یقین کر لیا

○

خیال تھا کہ تجھے رازداں بنا لیتے
مگر یہ لوگ، نئی داستاں بنا لیتے

تو ایک بار محبّت سے دیکھ لیتا اگر
زمینِ خود کو، تجھے آسماں بنا لیتے

تمہاری صحبتِ نامعتبر سے بہتر تھا
ہم ایک حلقۂ آوارگاں بنا لیتے

○

کس طرح کٹتی ہیں راتیں، جگنوؤں سے پوچھنا
تم بھی کچھ دن جاگنا، تیرہ شبوں سے پوچھنا

حُسن کیسے سُرخرو ہوتا ہے راہِ عشق میں
پانیوں میں تیرتے کچّے گھڑوں سے پوچھنا

تتلیاں کِس کی لگن میں اپنے رنگوں سے گئیں
تم کبھی اپنے بدن کی خوشبوؤں سے پوچھنا

○

یہ نام مُمکن نہیں رہے گا مقام ممکن نہیں رہے گا
غرور لہجے میں آگیا تو کلام ممکن نہیں رہے گا

یہ برف موسم جو شہرِ جاں میں کچھ اور لمحے ٹھہر گیا تو
لہو کا دل کی کسی گلی میں قیام ممکن نہیں رہے گا

اب اس قدر بھی نہیں ہے آساں کسی کو دل سے اتارنا یہ
یہ کام آساں سمجھ رہے ہو یہ کام ممکن نہیں رہے گا

منافقت کی یہ رسمِ نامختتم چلی ہے تو دیکھ لینا
دُعا تو دل کا معاملہ ہے سلام ممکن نہیں رہے گا

○

سکوں سے سانس لینے کے سبھی رستے مٹا دے گا
وہ قبروں پر بھی اِک دن دیکھنا پہرے بٹھا دے گا

پہنچنے ہی نہیں دے گا تمہیں وہ اپنی منزل تک
بہت چالاک ہے وُہ دوسرے رستے لگا دے گا

بہت سفّاک ہے اب بھی اگر تم نے نہ سمجھا تو
سروں سے چھین لے گا چادریں، خیمے جلا دے گا

مَیں اتنا بے خبر کب تھا، مجھے معلوم تھا لوگو!
مرا منصف مرے قاتل کے کہنے پر سزا دے گا

مَیں جتنی بھی وفا کر لُوں وہ ظالم بدگماں ہو کر
مرے خط پھاڑ دے گا اور تصویریں جلا دے گا

بظاہر متفق ہو جائے گا ہر ایک نقطے پر !
پھر اخباروں میں خبریں اپنی مرضی کی لگا دے گا

ایک شعر

اَوروں کی طرح میری رفاقت کے ہُنر سے
منزل پہ پہنچتے ہی مُکر جائے گا تُو بھی!

دو شعر

ستمگرانِ شہر کی ادا ہی اور ہو گئی
وہ مجھ سے کیا جُدا ہوا فضا ہی اور ہو گئی

مَیں جس کے انتظار میں چراغ کی طرح جلا
وہ شامِ وصل آئی تو ہوا ہی اور ہو گئی

بے فیض موسم کی رفاقت میں

خُداوندا !
تجھے معلوم ہے مَیں نے
یہ اپنی عُمر
کس بے فیض موسم کی رفاقت میں گذاری ہے
یقین و بے یقینی کی اذیّت میں گذاری ہے
خُداوندا !
تجھے معلوم ہے میرے
ہر اک جانب تری سو نعمتیں
بکھری ہوئی تھیں
ہزاروں راستے تھے

منزلیں تھیں
روشنی تھی
رنگ تھے، خوشبو تھی
پھُولوں سے لدی شاخیں تھیں، خواہش کی
تمنائیں، لبوں پہ مسکراہٹ کے
کئی نغمے سجائے رقص کرتی تھیں
کئی جگنو مری شاموں کے آنگن سے گزرتے تھے
مِری ہر آرزُو کی اپنی پیشانی تھی اور اُن سے
کئی سُورج اُبھرتے تھے
کئی مہتاب چہرے
جھیل سی آنکھیں لیے میرے تعاقب میں نکلتے تھے
مجھے آواز دے کر
روکنے کی کوششیں کرتے نہ تھکتے تھے
کئی دلدار موسم تھے
کہ جن میں تتلیاں بارش کے رنگوں میں نہاتی
ہاتھ پھیلاتی
مِرے قرب و جوار دیدہ و دل سے گذرتی تھیں

مگر میں نے
خدا وندا
تجھے معلوم ہے مَیں نے
تری ساری عنایت کو
تری ان نعمتوں کو آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھا
خدا وندا
تجھے معلوم ہے
تُو جانتا ہے
کہ مِرے دل اور مِری آنکھوں میں بس وُہ
موسمِ دلدار بستا تھا
اُسی موسم کی چاہت
اور محبّت کا کہیں
اِقرار بستا تھا
اُسی موسم کو دل نے اپنی صبح، شام جانا تھا
اگرچہ راہ میں آیا ہوا سارا زمانہ تھا
خدا وندا تجھے معلوم ہے
تُو جانتا ہے

دِلوں کے زخم
اور آنکھوں کی ساری کیفیّت پہچانتا ہے
مگر مَیں نے
اُسے جانا، نہ پہچانا،
مجھے جو بھی کہا اُس نے
اُسی کو زندگی جانا
اُسی کو روشنی جانا
خداوندا!
تجھے معلوم ہے "اُس نے"
بسر کی زندگی میری
چُرالی روشنی میری
تجھے معلوم ہے سب کچھ
خداوندا تجھے معلوم ہے سب کچھ
مِری عمرِ گذشتہ کا
مِری عمرِ رواں کا
ایک اِک لمحہ
اسی بے فیض موسم کی رفاقت کے ہی کام آیا

مگر اب مَیں
خداوندا!
مگر اب میں محبّت کے
اسی بے فیض موسم کی رفاقت کے
عذابوں
اور خوابوں سے
تھکا، ہارا ہوا انسان
رہائی چاہتا ہُوں
تِری سو نعمتیں ہیں
اُن سے تنہائی کی نعمت چاہتا ہُوں
خداوندا تجھے معلوم ہے میں نے
یہ اپنی عُمر کس بے فیض موسم کی رفاقت میں گذاری ہے
یقین و بے یقینی کی اذیت میں گذاری ہے
خداوندا!
مجھے تنہائی کی نعمت عطا کر دے!

آنکھیں بھول آیا ہوں

جس کمرے میں
تم دونوں اب پہروں تنہا رہتے ہو
اُس کمرے میں
غور سے دیکھو
میری کتنی یادوں
باتوں
اور کتابوں کے چہروں میں
حرف وفا کے چھپے ہوئے ہیں
ظالم گرد پڑی ہے ان پر

اس کمرے کی اِک اِک شے کو
غور سے دیکھو
وہیں،
مَیں پاگل
اپنی دونوں آنکھیں رکھ کر
بھول آیا ہوں !

○

مری غزل میں دکھوں کے سائے بھی حوصلوں کی شکست کے ہیں
یہ ساری باتیں یہ سارے قصے محبتوں کی شکست کے ہیں

بس ایک لغزش نے جانے کتنی کہانیوں کو جنم دیا ہے
کہ شہر بھر میں نشان میری صداقتوں کی شکست کے ہیں

جُدا ہی رکھے مسافروں کو کہ پھٹتے جاتے ہیں بادباں تک
یہ سارے منظر وفا کی مضبوط کشتیوں کی شکست کے ہیں

ندی کنارے جو دن گزارے تھے یاد آتے رہیں گے کب تک
کہ جتنے لمحے گزر رہے ہیں یہ اُن دنوں کی شکست کے ہیں

زمانے بھر کی سیہ زبانوں پہ جتنے الفاظ جل رہے ہیں
جو تجھ کو لکھے تھے چاند راتوں میں ان خطوں کی شکست کے ہیں

ملول چہرہ، اُداس آنکھیں، تھکان پاؤں میں گرد زنجیر
یہ سارے آثار زندگی میں مسافتوں کی شکست کے ہیں

سنبھال رکھو رفاقتوں کے سنہرے خوابوں کی سلطنت کو
جدائیوں کے یہ سنگ موسم دل آئینوں کی شکست کے ہیں

دو شعر

وہ جو اِک غزل تجھے بھائی تھی کہیں رہ گئی
مِری عُمر بھر کی کمائی تھی کہیں رہ گئی

کہیں گر گیا مِرے دل کی جیب سے خط ترا
وہ جو بات سب سے چُھپائی تھی کہیں رہ گئی

یہ رستہ اور ہے

مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ اب تُم وہ نہیں ہو
جسے سر سے
کبھی پاؤں تلک میں نے
محبت سے بھرے لفظوں کی خوشبو سے
سنوارا تھا
تمھیں شاید قد و قامت کا ہونا، خوش نہیں آیا
تمھیں شاید سخُن کا
اور سخن سے ملنے والی چاہتوں کا

وہ زمانہ، خوشش نہیں آیا
یہ تم کس راہ چلتے چلتے
کس رستے پہ جا نکلے
یہ رستہ چھین لے گا
خواب و خواہش کے خزانوں کو
تمھاری شہرتوں میں محترم سا جو حوالہ بن گئے تھے
اُن زمانوں کو
بدن کے اور دل کے
راستے کب ساتھ چلتے ہیں
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ اب تم وہ نہیں ہو!

ایک شعر

جو دل سے مرے کبھی نہیں تھے، میں ایسے لوگوں میں گھر گیا تھا
چراغ رستے بنانے والا تھا اور اندھیروں میں گھر گیا تھا

ہائیکو

بے یقیں عُمر کے جزیرے میں
کوئی تو شام معتبر ـــــ ٹھہرے
جس طرح اُس کی سانولی آنکھیں

کون کتنا بڑا فریبی ہے
آؤ اِک شام ہم محبت سے
اپنی اپنی ہتھیلیاں دیکھیں

رات کے پُرسکون لمحوں میں
ایک سورج ترے خیالوں کا
دل کی بستی میں راکھ ڈال گیا

متفرق اشعار

ظرف کی اتنی کمی تجھ میں یہ اندازہ نہ تھا
اس سے پہلے بند مجھ پر تیرا دروازہ نہ تھا

پہنا رہے ہو کیوں مجھے تم کانچ کا لباس
کیا بچ گیا ہے پھر کوئی پتھر تمہارے پاس

ہوائے شہر کبھی میرا تذکرہ بھی تو کر
میں اُس کا ذکر تو ہر روز سنتا رہتا ہوں

یہ کون ہے جو میری رُوح میں در آیا ہے
یہ کس کسک کو لیے شہر شہر پھرتا ہوں

مجھے تھا زُعم مگر اُس نے رہ بدلنے میں
ذرا بھی دیر نہ کی، مجھ سے مشورہ نہ کیا

بہتر ہے راستے سے ہٹا دیجئے مجھے
کب تک میں انتظار کا پتھر بنا رہوں

دیباچہ

دوسری بار پیدائش

محبت کرنے والوں کی پناہ گاہ روہی کے علاقے میں سسکتی ہوئی صدیوں کی صداقت
تی ہوئی ریت کے بھیت کی طرح شاعری میں صدائے بازگشت بنتی چلی گئی تھی۔ یہ
ر اور سوز اور گداز کی آواز تھی جو کوئی راز بن کر دلوں میں گھلتی ملتی تھی۔ پھر ایک
ر آدی ظہور نظر ویرانیوں کی کہانیوں کے کردار جیسا ظاہر ہوا۔ وہ عشق اور انقلاب کو
ب اور خواہش کے بالمقابل کرکے دکھی رہنے والا خوش باش شخص تھا۔ خواجہ فرید
، بعد اس علاقے میں کوئی اور ایسا آدی پیدا نہ ہوا تھا۔ ظہور نظر کو بھی یہ دعویٰ نہ
۔ اس نے کوئی دعویٰ کیا بھی نہ تھا۔ وہ سرائیکی میں شاعری کرتا تو اس کے لئے میں
مبالغہ کرنے کی کوشش کرلیتا۔ پھر جو ہوتا سو ہوتا۔ ظہور نظر مرگیا تو اس کی میت تین
ن تک دفن نہ ہوئے دی گئی۔ وہ کون تھا کہ شہر کا شہر جس کا دشمن ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً
وئی دوست شخص ہوگا۔

اس کے مرنے کے سال دو سال بعد منور جمیل قریشی اور نوشی گیلانی نے اس شہر
کج ادا و کج فہم میں ظہور نظر کانفرنس کر ڈالی۔ انہیں اس شہر میں کوئی روکنے ٹوکنے کی
جرات نہ کرسکا۔ پھر یہی دو تھے جو یہاں میرے اپنے ہوگئے مجھے بھا گئے۔ دلیری اور
لبری کا دائرہ سا دونوں نے بنایا جو پھیلتے پھیلتے لاہور سے جا لگا۔ نوشی گیلانی بالکل سامنے
نظر آنے والی شاعرہ بن گئی۔ اس کے پیچھے منور جمیل ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ
کھڑا دکھائی دیا۔ وہ اس کا سایہ بن گیا۔ نظر نہ آنے کی کوشش میں آدی اور بھی واضح
واضح نظر آنے لگتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے کوئی نہ کوئی عورت ہوتی ہے۔ یہاں یہ

حقیقت برعکس ہو گئی۔ ایک کامیاب عورت کے پیچھے ایک مرد تھا۔ جو لوگوں کی باتی
سن سن کر جواں مرد ہو گیا۔ سوچتا ہوں کہ اتنی بڑی حقیقت تلخ حقیقت کیوں ہوئی
نوشی گیلانی دُور آباد شہر میں رہتے ہوئے بھی معروف شاعرہ ہو گئی۔ میں نے پہلے کہیں
تھا۔ مرحوم و محبوب شاعرہ پروین شاکر کے بعد کوئی شاعرہ ہے تو وہ نوشی گیلانی ہے
پروین نے بھی نوشی کے لئے اپنے ایک مضمون میں اچھی باتیں کی تھیں جو میں
ایک اخبار کے ادبی ایڈیشن میں چھاپی تھیں۔ ورنہ پروین شاکر نے ایک بڑی عمر کی اید
نئی نویلی شاعرہ رخشندہ نوید کی کتاب کا فلیپ لکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ دانش ور شاہ
منصورہ احمد کے شعری مجموعہ "طلوع" کا دیباچہ ندیم صاحب کا نہ لکھا ہوتا تو اسے
دکھانا مشکل تھا۔ کچھ اور بھی شاعرات ہیں۔ فاطمہ حسن، شاہدہ حسن، یاسمین حمید او
ثمینہ راجہ۔ ان کے بعد کی نسل کی عائشہ مسعود ملک، فاخرہ بتول اور بھی کچھ نام۔ مگر
پروین شاکر کے بعد نوشی گیلانی کے سوا کس کا پہلا نمبر ہو سکتا ہے۔

بہاولپور شہر نے پھر انگڑائی لی اور وہ نوشی گیلانی کے خلاف چنگھاڑنے لگا۔ یہ ا
عورت ہے کہ مسجدوں میں جمعے کے خطبے اس کے ذکر سے بڑبڑا اُٹھے۔ دیواریں اس
کے نام سے وصال پا کر تڑپنے لگیں۔ تب میں نے "بہاولپور کی بہادر بیٹی" کے نام سے
کالم باندھا۔ مجھے گالیوں سے بھرے خط ملے۔ یہ خط مجھے ملے تھے جب میں نے نوشی
انٹرویو چھاپا تھا۔ یہ خط منور جمیل کو تو ملتے رہتے تھے۔ منور جمیل کے پاس کئی خط ہیں
جن میں کئی نشانیاں ہیں۔

اُس نے اُس کی دوستیاں اور دشمنیاں دونوں اختیار کرلیں۔ عشق اور انقلاب کی
روایت کو اپنی حکایت بنانے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے ہر رنگ کی شکایت کا سامنا
کیا بلکہ اپنا آمنا سامنا بھی کیا۔

اس تعلق خاطر نے ثابت کر دکھایا کہ رفاقت تو محبت سے بڑا رشتہ ہے۔ ایک دور
آباد بستی تلہ گنگ کے ایک بڑے شاعر منظور حیدر کا ایک شعر ہے۔

کہا ہے عارف کامل نے مجھ سے وقتِ وداع
عقیدتوں سے ہیں بالا رفاقتوں کے حقوق

رفاقتوں کے حقوق جیسے جیسے جتنے جتنے منور جمیل نے ادا کئے ہیں۔ اس بے درد
نے میں معلوم دنیا کے شاید ہی کسی معروف آدمی نے ادا کئے ہوں گے۔ میں نے
منور جمیل کے بغیر نوشی گیلانی کو نہ دیکھا تھا۔ شاید اس کے لئے مشکل تھا کہ ایسا
اب اس نے آسانیوں کی عادت کہیں سے لے لی ہے۔ اس نے امریکہ جا کے
ی کرلی تو کیا برا کیا۔ منور جمیل نے بھی بظاہر اس کا برا نہیں منایا۔ وہاں بھی اس کی
نتیں نادیدہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہیں۔ سوچتا ہوں کہ اتنا مخلص اتنا رفیق
کوئی ہو سکتا ہے۔ اس نے ان تمام دنوں میں کیسی کیسی نظروں کو نظرانداز کیا۔ اس
خود کو اپنی نظروں میں بھی گرنے نہ دیا۔ اسے دھکے بہت لگے اندر سے اور باہر
اس نے سب کچھ قبول کرلیا۔ اور سب کچھ مسترد کر دیا۔ یہ کام بیک وقت کس
ہوئے ہیں۔ وہ ایک مختلف آدمی ہے۔ بہت مختلف، اس نے ربط ضبط کی نئی کہانی
ی ہے۔

کوئی پوچھے کہ آخر نوشی گیلانی اور منور جمیل کا آپس میں رشتہ کیا تھا۔ پھر
لور حیدر کا شعر سنئے۔

وہ شخص مجھے آج بھی بھولا نہیں حیدر
رشتہ ہے کوئی رشتۂ ایماں سے زیادہ

ے یہ کوئی نیا رشتہ ہے اور بہت پرانا۔ رشتہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ رشتہ وہ ہے جس
نام نہ ہو۔ رشتے کو نام دے دیا جائے تو وہ آلودہ ہو جاتا ہے۔ محدود ہو جاتا ہے۔
شتہ تو وہ ہے جو بڑھتا رہتا ہے۔ وہ کیا رشتہ ہے جو روز نہیں امڈتا۔ اس میں ہر لمحہ
وئی نئی بات کوئی بے ساختہ پن پیدا نہ ہو۔ رشتہ! جس میں کھٹکا نہ ہو لپکا نہ ہو۔ وہ کیا
شتہ ہے۔ روایتی رشتہ داری تو ایک قید کی طرح ہے۔ رشتہ تو آدمی کو آزاد کرتا ہے۔
ے لامحدود کرتا ہے۔ تو رشتہ رشتے کے علاوہ بھی کچھ ہے تو منور اور نوشی کے درمیان
ہی کچھ تھا۔ مگر اب کیا ہے ---- اب کچھ بھی نہیں ہے۔ کبھی کچھ ہوتا ہے، کبھی
کچھ نہیں ہوتا۔

پہلے منور جمیل کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ وہ اپنے اندر کے شاعر کو باہر لاتا۔ نوشی
گیلانی شاعرہ کے طور پر محبوب ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ سب کچھ منور کو نامنظور
تھا۔ اپنی شاعری کے صدر دروازے پر اس نے خواب اور خواہش اور خوف کا پہرہ بٹھا

رکھا تھا۔ اب رات کا پچھلا پہر ڈھل رہا ہے۔ اندھیرا سانولا ہو جائے اور رات کے پچھلے پہر جیسا رفیق جگراتوں کا جگر چیر دے۔ دیر کی اپنائیت جلدی کی اجنبیت کے زہر میں ملا دی جائے۔ تب رفاقتوں اور رقابتوں میں فرق نہیں رہتا۔ پھر کوئی کیا کرے۔ لوگ کیا کرے۔

اب یہ ہوا ہے صرف کہ منور جمیل اپنی کیفیتوں اور اذیتوں کو رلا ملا کے شعر بنا جا رہا ہے۔ اس نے تو کبھی اپنے شاعر ہونے کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ پھر یہ تعارف اب ہوتا۔ نوشی گیلانی کا ہم سفر ہونا اسے قبول تھا۔ وہ اس کا ہمراز ہونے سے بھی ڈرتا رہا۔ اس نے کیا کیا کچھ قبول کرلیا تھا۔ اور پھر دعا قبول ہونے کی گھڑی سر پر آکر کھڑی ہو گئی۔ شاعری بھولی ہوئی دعا کی طرح ہے۔ یہ تحریر منور جمیل قریشی کی شاعری کے بعد صرف آمین کی طرح کی چیز ہے۔

علیحدگی جدائی کا روپ دھار چکی ہے۔ یہ شاعری کے لئے بہت ضروری شے ہے۔ یادیں منور کے خمیر ضمیر میں تڑپتی ہیں۔ شاعر کے دل میں نیا شاعر زندہ ہوا ہے۔ تو میں اسے مبارکباد کہوں۔ یا اس سے تعزیت کروں۔ اس نے اپنے اندر کچھ مار دیا ہے۔ کچھ زندہ کرلیا ہے۔ میں گہرے دکھوں کے دریا کے کنارے پر آ کھڑا ہوں۔ دوسرے کنارے پر وہ ہے۔ مجھے اپنے قبیلے کا سردار منیر نیازی یاد آرہا ہے۔

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

حیرت ہے کہ منور نے یہ کام کیسے کرلیا۔ مگر اس نے کیا کیا کام نہیں کئے۔ وہ اس کی قربتوں میں نفی ہو گیا تھا۔ اس کی فرقتوں میں اثبات ہو رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ تو اچھا شاعر ہے تو پھر جو ہوا۔ اچھا نہیں ہوا کیا۔ آخر ہوا کیا ہے۔ اس لئے منور جمیل قریشی کی شاعری ذرا دھیان سے پڑھنا پڑے گی۔ شاعری کہی اور ان کہی کے بین بین ظہور کرتی ہے۔ مجھے ظہور نظر کا خیال آتا ہے۔ کیا کوئی شخص دوسری بار بھی کسی شہر میں پیدا ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی